فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۱۶

(بہ ترتیب حروف تہجی)

ماہ جولائی تا دسمبر ۱۹۷۵ء

شمار	مضمون نگار	صفحہ	شمار	مضمون نگار	صفحہ
۱-	جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی	۱۶۵، ۲۴۵، ۴۰۵	۸-	عبد السلام قدوائی ندوی،	۵ - ۱۸۵، ۲ - ۱۶ - ۲۴۴، ۳ - ۳۲۲ - ۴۰۲
۲-	جناب الطاف حسین خان شروانی اسلامیہ کالج اٹاوہ	۲۶۳	۹-	مولانا عبد السلام ندوی مرحوم	۳۰۶، ۴۶۳
۳-	جناب جگن ناتھ آزاد	۲۵، ۴۳۹	۱۰-	جناب غلام محمد نظام الدین صاحب مغربی لکچرر و صدر شعبۂ تاریخ اردو آرٹس کالج، حیدر آباد دکن	۴۴،
۴-	جناب مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب واصف دہلی	۳۰۰	۱۱-	جناب کبیر احمد صاحب جائسی استاذ شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی	۲۱۶
۵-	ریحانہ خاتون صاحبہ، ایم، اے، ایم فل شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ	۱۱۲	۱۲-	جناب مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم مدرسہ جامعۃ الرشاد و یونانی میڈیکل کالج اعظم گڈھ	۴۶۲
۶-	سید صباح الدین عبد الرحمٰن	۲، ۸۲، ۱۱۸، ۱۵۵، ۲۴۹، ۳۱۲، ۳۱۹، ۳۳۵، ۴۰۰، ۴۷۶	۱۳-	مولوی محمد عزیز صاحب بہاری مرکزی دار العلوم بنارس	۱۸۷، ۲۵۹
۷-	ضیاء الدین اصلاحی	(rows 6–7 bracketed together)			

شعراء

فہرست مضامین معارف

جلد ۱۱۶

(بہ ترتیب حروف تہجی)

از جولائی ۱۹۷۵ء تا دسمبر ۱۹۷۵ء

استدراک

تلخیص و ترجمہ

باب التقریظ والانتقاد

ادبیات

مطبوعات جدیدہ

جلد ۱۱۶ ماہ جولائی ۱۹۷۵ء مطابق ماہ رجب المرجب ۱۳۹۵ھ عدد ۱

مضامین

مقالات

تلخیص و ترجمہ

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

دینی تعلیمی کاؤنسل اترپردیش گذشتہ سولہ سال سے کام کر رہی ہے، اس کا مقصد مسلمان بچوں اور بچیوں کیلئے اردو کے ذریعہ ایسی دینی تعلیم کا انتظام کرنا ہے جس سے وہ اچھے شہری ہونے کے ساتھ اچھے مسلمان بن کر اپنی ایمانی، روحانی اور تہذیبی خصوصیات کو باقی رکھیں،

اس کی ابتدائی تحریک ۱۹۵۹ء میں مشرقی یو۔پی کے ایک ضلع بستی میں ہوئی، مگر اس کے کچھ مخلص کارکنوں کی قوت ارادی کی بدولت اب یہ پورے اترپردیش کی ایک منظم جماعت بن گئی ہے، اس کی طرف سے اب تک یو۔پی کے مختلف حصوں میں نو ہزار خود کفیل مکاتب کھولے جا چکے ہیں جن میں تقریباً ساڑھے لاکھ بچے اور بچیاں اس کی تیار کردہ درسی کتابوں کے ذریعہ زیر تعلیم ہیں، اس وقت اترپردیش میں ۳۶ لاکھ مسلمان بچے اور بچیاں ہیں جن کیلئے بھی ایسے مکاتب کھولنے کی ضرورت ہے، مگر یہ کام مالی وسائل کی کمی اور قانونی دقتوں کی وجہ سے آسان نہیں مگر اس کے کارکنوں کا اخلاص اور عزم کی پختگی اس نسل کا اصلی سرمایہ ہے، امید ہے کہ وہ ساری مشکلات پر قابو پالیں گے، مولانا ابوالحسن علی ندوی اس کے دل، جناب قاضی عدیل عباسی صاحب اس کے دماغ، جناب ظفر احمد صدیقی، ڈاکٹر اشتیاق قریشی، جناب ریاض الدین احمد اور مولوی محمود الحسن اس کے اعضا ہیں، انہی کی بدولت یہ سرگرم عمل ہے جس سے متاثر ہو کر بہار، کرناٹک، آندھرا اور مدھیہ پردیش میں بھی اس قسم کی سرگرمیاں جاری ہو چکی ہیں، اس کے کارکن اپنی مخلصانہ کوششوں کے لئے تعریف و مبارکباد کے مستحق ہیں،

یہ کاؤنسل کچھ وقفے کے بعد اپنی ریاستی کانفرنس بھی کرتی ہے، اس کی چوتھی کانفرنس ۲۲، ۲۳ جون کو لکھنؤ میں ہوئی، اس کے کھلے اجلاس سے پہلے ایک سیمینار بھی ہوا جس میں اردو کی اہمیت اور افادیت پر مفید مقالے پڑھے گئے، مگر اردو زبان اب مقالہ نگاری کی خواہاں نہیں، وہ اپنے بولنے والے اور حامیوں سے ایسی عملی قربانی اور خون جگر کی لالہ کاری چاہتی ہے جو اس کو وہ مقام دلا سکے جس کی وہ مستحق ہے، آج پیش کرنا فی الحال کوئی اگر و قربانی

کھلے اجلاس میں بڑی تعداد میں مسلمان شریک ہوئے، اس کا افتتاح مولانا منت اللہ رحمانی صاحب امیر شریعت بہار نے کیا، انھوں نے اپنے پُرمغز اور کارآمد خطبہ میں مسلمانوں کو یہ پیغام دیا کہ ان کے بچوں کا اپنے دینی تصورات اور اعتقادات پر قائم رہنا ان کا فطری حق ہے جو چھینا نہیں جا سکتا ہے، اس کو حاصل کرنا ان کا فریضہ ہے، امید کہ یہ پیغام ہندوستان کے ہر حصہ میں پہونچے گا،

اس کانفرنس کی صدارت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے کی، انکے خطبۂ صدارت میں اُن کی جراحتِ دل کا درد تھا، بڑی تلخ نوائی سے اپنی ملت کا بھی احتساب کیا کہ وہ خود فیصلہ کرے کہ اس نے اپنی دینی، روحانی، اخلاقی اور لسانی امنگوں کی تکمیل کرنے میں کون سی جدوجہد کا ثبوت دیا، انھوں نے اس اجلاس کے آخر میں ایک بہت ہی مؤثر اور مدلل تقریر میں یہ بھی کہا کہ اگر مسلمان اپنی غفلت اور بے عملی سے اپنی ملی صحت خود بگاڑ چکیں گے تو پھر بڑے سے بڑے صلحا، اور اتقیا بھی زندہ ہو کر اس کو توانا اور صحت مند نہیں بنا سکتے، ان کا یہ احتساب اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے، اس وقت تو صرف ع تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہ محراب لیکن تقدیر ہی تدبیر سے ہر زمانہ میں یہ کہتی رہی ہے،

ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے — بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کے

مگر یہ بھی صحیح ہے کہ سامعین کی خاموش نگاہیں یہ کہہ رہی تھیں،

خون رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر — میخانۂ حافظ ہو کہ بت خانۂ بہزاد

اس وقت مسلمان ایسے معمار کے منتظر ہیں جو اپنے خون رگ کی گرمی سے ان کی زندگی کی تعمیر ازسرِ نو کر دے، وہ بے عمل ضرور ہو رہے ہیں، مگر ان کا نفسیاتی ذہن بہت زیادہ نہیں بگڑا ہے، وہ ایمان کے جمال لازوال سے یکسر محروم نہیں ہوئے ہیں، اُن کی اکثریت اس کی خواہاں ہے کہ وہ اپنے اخلاق و کردار سے اچھے شہری اور محبِ وطن بھی بنیں اور ان کے ذہنی حصار کی سرحدیں بھی ہر طرح کے جارحانہ یلغار سے محفوظ رہیں، مگر سوال یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں کیسے حاصل ہوں قیادت مقتدیوں میں حرکت چاہتی ہے، مقتدی

قیادت کی دست گیری کے طلب گار ہیں، اگر دونوں طرح طرح کی مشکلات میں محصور ہیں جن سے دونوں کی تعمیری اور عملی قوتیں دبتی چلی جاتی ہیں، دونوں کی نگاہیں غیر شعوری طور پر ایک دوسرے سے پوچھ رہی ہیں، کہ دبی قوتیں کیسے ابھریں اور کیونکر ابھاری جائیں، ابھرنے اور ابھارنے کی اس کشمکش میں زیادہ ذمہ داری قیادت پر آتی ہے،

جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتحِ زمانہ

دارالمصنفین میں تصنیف و تالیف اور طباعت کا کام حسب دستور جاری ہے، مگر بجلی کی کمی کی وجہ سے اس کے پریس کی طباعت کی کارگذاری خاطر خواہ نہیں، وقت پر بجلی نہ ملنے کی وجہ سے اس کے کارکن اکثر بیکار بیٹھے رہتے ہیں، اس لئے پرانی اور نئی کتابوں کی طباعت میں غیر معمولی تاخیر ہو جاتی ہے، پھر بھی اس سال اب تک تین نئی کتابیں خریطۂ جواہر، ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں جلد دوم، اور ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری جلد اول چھپ چکی ہیں، غالب: مدح و قدح کی روشنی میں، جلد اول کا نصف حصہ چھپ چکا ہے، پوری کتاب جلد چھپ کر ناظرین کے ہاتھوں میں آجائے گی،

کاغذ کی گرانی اور طباعت کے بڑھتے ہوئے اخراجات کی وجہ سے یہاں کی مطبوعات کی قیمت میں نظر ثانی کرکے اس میں ۲۵ فی صدی کا اضافہ کر دیا گیا ہے، پھر بھی دوسری جگہوں کی کتابوں کے مقابلہ میں ہماری مطبوعات سستی ہیں، علمی جواہر پاروں کا ایک قدرداں ان کی قیمت کا خیال نہیں کرتا، بلکہ ان کو خریدتے وقت خوش ہو کر یہ کہتا ہے،

جا دے چند دادم جاں خریدم

مقالات

مولانا حیدر حسن خان ٹونکی

از

جناب مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی

(۲)

نواب صاحب نے سید صاحب اور ان کے رفقاء کے حالات اور جہاد کے واقعات مستند عینی شاہدوں سے بڑی تفصیل سے لکھوائے تھے، جو سید صاحب اور ان کی تحریک جہاد کے بارہ میں لکھنے والوں کے لیے اہم ماخذ ہے۔ نواب صاحب کی دینداری کا اثر ان کے سارے خاندان پر تھا، اور سب عقیدہ کی صحت، عمل کی درستی، علم کی قدر اور علماء کی عقیدت میں ممتاز تھے، مولوی صاحب کے زمانہ میں نواب وزیر الدولہ تو نہ تھے مگر ان کے جانشین اور اہلِ خاندان علم کی اشاعت اور علماء کی قدردانی کا وہی جذبہ رکھتے تھے۔

ٹونک کے مدارس، نواب ابراہیم علی والی ریاست تھے اس زمانہ میں ٹونک میں دو اہم درسگاہیں تھیں ایک کا نام مدرسۂ خلیلیہ تھا، اور دوسرے کا ناصریہ۔ مدرسۂ خلیلیہ کے صدر المدرسین مولانا عبدالحق خیرآبادی کے نامور شاگرد حکیم برکات احمد صاحب تھے اس کے سرپرست نواب ابراہیم علی خاں تھے، اور مدرسۂ ناصریہ کے سرپرست نواب صاحب کے بھائی صاحبزادہ عبدالرحیم صاحب تھے، ٹونک کے امراء میں جتنی دینداری اور خاکساری تھی اس کا

یقین کرنا دشوار ہوتا۔ اگر اپنی آنکھوں سے اس دور کی جھلک نہ دیکھی ہوتی، میں اودھ کے تعلقداروں کے جاہ و جلال کو دیکھ چکا تھا ٹونک جب گیا اور وہاں کے جاگیرداروں اور نواب صاحب کے اہل خاندان سے ملنے کا اتفاق ہوا تو ان کے انکسار اور سادگی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

ملازمت صاحبزادہ عبدالرحیم کے جذبۂ دینی نے مدرسۂ ناصریہ کو علوم دینیہ اور فنون عقلیہ کا مرکز بنا دیا، ان کی قدردانی سے یہاں بہت سے ذی استعداد مدرس جمع ہو گئے، مولانا حیدر حسن خان تکمیل علوم سے فارغ ہو کر ٹونک پہونچے تو صاحبزادہ صاحب کی نظر انتخاب ان پر پڑی اور انھیں بھی تدریس کی خدمت سپرد کر دی، مولوی صاحب ابھی نو وارد تھے مگر جلد ہی ان کی صلاحیت واستعداد کے جوہر کھلنے لگے اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کی مہارت فن اور قوت تدریس کی دھوم مچ گئی، ٹونک اہل کمال کا مرکز تھا بڑے بڑے جید علماء کی مسندیں بچھی ہوئی تھیں خود مدرسۂ ناصریہ میں بھی اہل کمال کا مجمع تھا، اور مولانا سیف الرحمٰن[1] جیسے ذہین وطباع، صاحب فکر و نظر اور نکتہ سنج و خوش بیان استاد موجود تھے، ایسے حالات میں کسی نئے آدمی کی دال گلنا مشکل تھی مگر چند ہی مہینے میں سربرآوردہ علماء اور برسوں کے منجھے ہوئے اساتذہ ان کی استعداد کے قائل ہو گئے اور طلبہ کھنچ کھنچ کر ان کے درس میں جمع ہونے لگے۔

[1] مولانا سیف الرحمٰن اصلاً افغانستان کے باشندہ تھے وہیں پلے بڑھے اور متوسطات تک تعلیم حاصل کی پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے ہندوستان آئے اور مولانا لطف اللہ سے علی گڑھ میں رہ کر استفادہ کیا پھر مولانا رشید احمد گنگوہی سے حدیث شریف کی تکمیل تعلیم حاصل کی اور ان کی خدمت میں کچھ عرصہ ٹھہر کر کسب فیض کیا پھر ٹونک آئے، یہاں قاضی محمد دوست کابلی کی صاحبزادی سے شادی ہوئی اور وہیں آباد ہو گئے مدرسۂ ناصریہ میں مدرس مقرر ہوئے، بہت عرصہ تک وہاں درس دینے کے بعد پھر دلی آئے اور مدرسۂ فتحپوری میں استاد ہو گئے ان کو انگریزوں کا تسلط ناپسند تھا، اور ان سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جذبۂ جہاد دل میں رکھتے تھے، شیخ الہند مولانا محمود حسن کی صحبت میں اس جذبہ کو

(بقیہ حاشیہ ص ۷)

سفر حج اور بیعت مدرسۂ ناصریہ کی ملازمت کے زمانہ میں مولانا کو حج کا موقع مل گیا، اور فریضۂ حج کی ادائیگی اور مدینہ منورہ میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، اس سلسلہ میں حرمین شریفین کے فیوض و برکات سے مستفید ہونے کے علاوہ بہت سے علماء و مشائخ سے ملاقات کا موقع بھی ملا، ان سے تفسیر و حدیث، فقہ و اصول اور اخلاق و تصوف کے بہت سے مسائل پر گفتگو ہوئی بہت سی نایاب کتابیں نظر سے گزریں جن سے علم و فن کے نئے نئے گوشے سامنے آئے علمائے حرمین کی مجالس درس میں بھی شریک ہوئے اور ان کے افکار و خیالات اور ان کے طریقۂ درس سے واقفیت حاصل کی۔

مولانا کو ایک عرصہ سے خیال تھا کہ کسی صاحب نسبت بزرگ سے بیعت ہو جائیں، ہندوستان میں بہت سے بزرگ موجود تھے، بعض بزرگوں سے ملاقات بھی کی تھی مگر ابھی تک کسی کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دیا تھا، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا نام بچپن سے کان میں پڑا تھا۔ مکہ معظمہ پہونچے تو ان کی زیارت کی خواہش ہوئی، حاضر خدمت ہوئے تو بہت متاثر ہوئے، اور دل نے کہا کہ اسی آستانہ کو عقیدت کا مرکز بنانا چاہئے، حاجی صاحب سے درخواست کی کہ داخل سلسلہ فرما لیجیے، ان کو بھی ان کے اندر طلب صادق نظر آئی، اور حلقۂ ارادت میں داخل کر لیا۔ ایک سال تک مولانا مکہ مکرمہ میں حاجی صاحب کی خدمت میں رہے اور ان کی

بیگم

(بقیہ حاشیہ ۶) تقویت ہوئی، اور ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۴ء) میں ان کے اشارہ سے سرحد پہونچ گئے، اور حاجی ترنگ زئی کے ساتھ مل کر انگریزوں سے جہاد شروع کر دیا، لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو کابل چلے گئے، انگریزوں نے ان کو حوالہ کرنے کے لئے امیر حبیب اللہ خاں پر دباؤ ڈالا تو یاغستان چلے آئے، امان اللہ خان بادشاہ ہوئے تو کابل واپس آگئے، اور معزز خدمات پر مامور رہے، ہندوستان کی آزادی کے بعد پشاور چلے گئے، اور وہیں اپنے گاؤں متھرا میں ۱۳۶۹ھ (۱۹۴۹ء) میں وفات پائی، مولوی صاحب ان کی ذہانت، علمی صلاحیت اور مجاہدانہ جذبات کا بہت ذکر کرتے رہتے تھے۔

ہدایت کے مطابق اذکار و اشغال میں مصروف رہے، اور اس راہ میں ایسی صلاحیت پیدا کر لی کہ حاجی صاحب نے خلافت سے سرفراز فرمایا، مولوی صاحب نے اس موقع پر عرض کیا کہ حضرت میں تو درس و تدریس میں مشغول رہتا ہوں، اس بارہ میں آپ کا کیا حکم ہے، حاجی صاحب نے فرمایا آپ بہت اچھا کام کر رہے ہیں اس مبارک مشغلے میں لگے رہیے، اس کے ساتھ کچھ اور اذکار کی تلقین کی ایک خاص نصیحت یہ کی کہ امراء سے تعلق نہ رکھئے اور انکی صحبت سے دور رہیے۔

مرشد کی ہدایت پر عمل

مولوی صاحب نے مرشد کی یہ ہدایت گرہ میں باندھ لی اور ساری زندگی اس پر عمل کرتے رہے، سفر و حضر، آرام و تکلیف کسی حال میں تہجد کی نماز ترک ہونے نہ دی، نہ ان اوراد و اشغال میں کبھی فرق آنے دیا، جن کی بجا آوری کی حاجی صاحب نے تاکید کی تھی، کچھ رات رہے بیدار ہو جاتے بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ تہجد پڑھتے اس میں ان کی قرارت بڑی موثر ہوتی، طویل قیام کے ساتھ رکوع و سجود بھی طویل کرتے، رکعتیں پوری کرنے کے بعد صبح تک وظائف میں مشغول رہتے، صبح کی نماز اول وقت، اندھیرے (غلس) میں پڑھتے، اس میں بھی طویل سورتیں پڑھتے اور انھیں کی مناسبت سے رکوع و سجود بھی دیر تک کرتے رہتے اگر کوئی رکوع کی حالت میں پہونچتا تو اطمینان سے ثنا پڑھ کر رکوع میں شریک ہو جاتا اور تیز رفتار اشخاص تو دو ضو بھی کر لیتے، صبح کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک چہرہ پر ایک کپڑا ڈال لیتے اور حاجی صاحب کے متعین کردہ ایک خاص وظیفہ میں مصروف رہتے، پھر اشراق کی نماز پڑھ کر اپنے کاموں میں لگتے۔

امراء وحکام سے احتراز

حاجی صاحب نے فرمایا تھا کہ امیروں سے تعلق نہ رکھنا، ان سے ملنے میں دین کا ضرر ہوتا ہے، اس ارشاد پر اس شدت سے عمل کیا کہ کبھی کسی امیر یا والی حکومت کا

منہ بھی نہیں دیکھا، مولانا ٹونک کے باشندہ تھے، ریاست کے حالات سے جو لوگ واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہاں اس ہدایت پر عمل کتنا خطرناک ہو سکتا تھا، ۱۹۲۱ء میں جب ہندوستان میں آزادی کی تحریک کا زور تھا تو ٹونک کے باشندوں نے بھی آزادی کا مطالبہ کیا، اس تحریک میں سادات قافلہ پیش پیش تھے، چند دن آزادی پسندوں کا زور رہا، پھر نواب نے اپنی وفادار فوج کی مدد سے اپنے اقتدار کو مستحکم کر لیا، سادات کی جائیدادیں ضبط ہو گئیں، اور انھیں ریاست سے خارج کر دیا گیا۔ مولوی صاحب کے سادات سے دیرینہ تعلقات تھے، ان میں ان کے دوست اور عزیز شاگرد تھے، اس بنا پر ان کو بھی شبہہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، شہر کے دوسرے مشتبہ لوگوں نے نواب صاحب اور ان کے متوسلین سے مل کر اپنی صفائی پیش کی اور وفاداری کا یقین دلایا، مگر مولوی صاحب نواب صاحب کی خدمت میں نہ گئے، ان کے ہمدردوں نے ان کی طرف سے صفائی پیش کی، نواب صاحب نے کہا اچھا انھیں میرے پاس لے آؤ، ان لوگوں نے بڑی منت سماجت کی، اور عرض کیا کہ اس وقت نواب صاحب سے ملنا بہت ضروری ہے، ورنہ وہ بدظن ہو جائیں گے، مگر مولوی صاحب مرشد کی نصیحت کو نظر انداز کرنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئے جتنی تاخیر ہوتی جاتی تھی اسی قدر بدظنی میں اضافہ کا امکان بڑھتا جاتا تھا، نواب صاحب کے مقربین میں جو لوگ مولوی صاحب کے ہمدرد تھے انھوں نے نواب صاحب کو ان کی خیر خواہی کا یقین دلایا لیکن نواب صاحب نے کہا کہ یہ کیسا خیر خواہ ہے، جو میری صورت سے بیزار ہے، حالات بے حد خطرناک تھے، مگر مولوی صاحب حاجی صاحب کی ہدایت پر جمے رہے، بالآخر ان کے بھائیوں اور عزیزوں نے مشورہ دیا کہ نواب صاحب سے نہیں ملتے ہو تو پھر گھر بار چھوڑ کر ریاست سے باہر چلے جاؤ، چنانچہ وہ کئی برس تک ٹونک

نہیں گئے۔

اسی طرح ایک مرتبہ نواب صاحب بہت بیمار ہوئے مشیروں نے مشورہ دیا کہ ریاست کے تمام علماء و مشائخ آیات شفا، پڑھ کر نواب صاحب پر دم کریں، اس موقع پر بھی مولوی صاحب نے گریز کرنا چاہا مگر دوستوں نے سمجھایا کہ یہ بڑا نازک وقت ہے سب لوگ دم کرنے جا رہے ہیں آپ نہ گئے تو بدگمانی ہوگی، جب لوگوں نے بہت سمجھایا تو گئے اور آیتیں پڑھ کر دم کر دیں مگر نواب کے چہرہ پر نظر نہیں ڈالی۔

نواب ابراہیم علی خاں کے انتقال کے بعد نواب سعادت علی خاں ان کے جانشین ہوئے تو ان کے ساتھ بھی مولوی صاحب کا یہی معاملہ رہا۔ بے تعلقی کی وجہ سے مولوی صاحب ان کو پہچانتے نہ تھے، ایک تقریب میں مولوی صاحب شریک تھے نواب صاحب بھی آگئے، مولوی صاحب نے پہلے کبھی دیکھا نہیں تھا اس لئے پہچان نہ سکے مگر جب صاحب خانہ نے بتایا تب بھی ملنے کی کوشش نہیں کی مولوی صاحب کا زندگی بھر یہی معمول رہا، اور اس بارہ میں کسی مصلحت یا خوف کی کبھی پروا نہیں کی اگر کسی دوسرے میں بھی یہ بات دیکھتے تو بہت خوش ہوتے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی امراء اور والیان ملک سے ربط ضبط پسند نہیں کرتے تھے، دارالعلوم دیوبند انھیں بہت عزیز تھا، اس کی خدمت میں انھوں نے اپنی زندگی لگا دی تھی، اس کے مصارف کے لیے سرمایہ کی فراہمی کی بڑی کوشش کرتے تھے، مگر اس غرض سے امیروں اور حکمرانوں کے در دولت پر دستک دینے کے بجائے عوام سے چندہ مانگنا پسند کرتے تھے، اور اس کو باعث خیر و برکت سمجھتے تھے، مولوی صاحب ان کی اس روش سے بہت خوش تھے، فرماتے تھے کہ ایک بار وہ رام پور آئے، شہر میں ان کا بڑا اثر وعظ ہوا جس میں بکثرت لوگ شریک ہوئے، اس موقع پر دارالعلوم کے لیے عوام سے چندہ

کی اپیل کی اور خاصی رقم جمع ہوگئی۔ نواب کلب علی خاں اس وقت زندہ تھے، ان کی داد و دہش کا بڑا شہرہ تھا، لوگوں نے توجہ بھی دلائی، بلکہ شاید یہ بھی کہا کہ نواب صاحب ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے مگر مولانا محمد قاسم نے معذرت کر دی مولوی صاحب اس واقعہ کو بیان کرتے تو بہت خوش ہوتے

صاحبان جاہ و تمکنت سے اعراض

مولوی صاحب، والیان ملک کے علاوہ دوسرے اغنیاء، اہل ثروت اور اصحاب جاہ و حشم سے بھی راہ و رسم پسند نہیں کرتے تھے، والیان ملک کی طرح ان کی صورت دیکھنے سے احتراز تو نہ تھا، مگر ربط ضبط کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، علماء نامدار اور مشائخ ذی شان کی ملاقات سے بھی حتی الامکان اجتناب کرتے تھے کہتے تھے کہ یہ لوگ ہمہ وقت اپنے کو لئے دیئے رہتے ہیں نشست و برخاست، چال ڈھال اور بات چیت سب میں انکی ایک خاص شان ہوتی ہے، ایسے لوگوں سے مل کر مجھے خوشی نہیں ہوتی لیکن جو لوگ تمکنت سے پاک ہوتے اور خلوص سے ملتے ان کی قدر کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی کام سے رام پور تشریف لے گئے۔ سامان سرائے میں رکھ دیا۔ پھر مولانا فضل حق[۱] سے ملنے مدرسہ عالیہ گئے،

[۱] مولانا فضل حق رامپوری اپنے زمانہ میں بڑے صاحب علم و کمال اور چوٹی کے مدرس سمجھے جاتے تھے [illegible]ھ (۱۸۶۲ء) میں رامپور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی پھر علی گڑھ اور بریلی میں مولانا لطف اللہ اور مولانا ہدایت علی سے متاخرین اور متقدمین کی اونچی کتابیں پڑھیں پھر مولانا عبدالحق خیرآبادی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے اور علوم عقلیہ میں کمال حاصل کیا، حدیث شریف کی تعلیم شیخ حسین یمانی سے حاصل کی تھی، وہ عقلی اور نقلی دونوں علوم سے واقف تھے لیکن معقولات سے زیادہ اشتغال رہا اور ان فنون میں صاحب نظر سمجھے جاتے تھے،

سب سے پہلے بریلی کے مدرسہ طالبیہ میں ملازم ہوئے، پھر بھوپال، رامپور اور کلکتہ کے مدرسہ عالیہ میں
(بقیہ حاشیہ ص ۱۰)

وہ بڑے تپاک سے ملے پھر پوچھا سامان کہاں ہے، یہ سن کر کہ شہر میں ہے کہا مجھ سے زیادہ آپ کی میزبانی کا مستحق اور کون ہو سکتا ہے پھر آدمی بھیج کر فوراً سامان منگوا لیا، مولوی صاحب نے کہا میں مولویوں سے مل کر کم ہی خوش ہوتا ہوں، مگر آپ سے مل کر جی خوش ہو گیا، یہ حسن اخلاق کہاں سے آیا، فرمایا کہ میں نہ پیر ہوں نہ بڑا آدمی پھر رامپور کا پانی بھی اخلاق گر ہے، اس ملاقات کے بعد مولوی صاحب مولانا فضل حق کے گرویدہ ہو گئے اور زندگی بھر ان کی خوبیوں کا ذکر کرتے رہے،

تدریس کی شہرت سفر حج سے واپسی کے بعد حسب سابق مدرسہ ناصریہ میں پڑھانے لگے لیکن اب ان کی شہرت ٹونک ہی تک محدود نہ تھی، بلکہ دور دور ان کا نام پہونچ گیا تھا، اور ملک کے دوسرے مدارس کے منتظمین کی ان پر نظر پڑنے لگی، اور زیادہ مشاہرہ پر طلب کئے جانے لگے، لیکن ان کی وفاداری اور قناعت پسندی نے ٹونک سے باہر قدم نکالنے کی اجازت نہ دی، ناظم ندوۃ العلماء حکیم سید عبدالحی صاحب کی جوہر شناس نگاہ نے ان کی صلاحیت کا پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا، وہ بھی مولانا لطف اللہ، مولانا غلام احمد اور شیخ حسین کے حلقۂ درس میں بیٹھ چکے تھے، انھیں مولانا کی لیاقت کا پورا علم تھا، اس لئے ان کی خواہش تھی کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسند درس کو زینت

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱) تدریس کی خدمت انجام دی آخر میں مدرسۂ عالیہ رامپور میں صدر المدرسین کے عہدہ پر فائز ہوئے اور آخر تک یہیں رہے، ان کی تصانیف میں ظفر حامدی اور فضل التحقیقات فی مسئلۃ الصفات کے علاوہ تلویح حمد اللہ میر زاہد اور سید شریف پر حواشی، اور دروس البلاغ کی شرح قابل ذکر ہیں علم و فضل میں اس کمال کے باوجود بڑے خلیق، سادگی پسند اور خاکسار تھے ۱۳۵۸ھ (۱۹۳۹ء) میں رامپور میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ (نزہۃ الخواطر)

بحیثیت حکیم صاحب مرحوم کی ٹونک میں عزیزداری تھی، ان کے عزیزوں سے مولانا کے گہرے روابط تھے، انھوں نے ان سب وسائل سے کام لیا لیکن صاحبزادہ عبدالرحیم سے مولانا کو ایسا تعلق خاطر تھا، اور ان کے دینی جذبہ، مذہبی شوق اور علمی قدردانی سے اتنے متاثر تھے کہ کسی طرح مدرسہ ناصریہ سے علحدہ ہونے اور ٹونک چھوڑ کر باہر جانے پر آمادہ نہ ہوئے لیکن حکیم صاحب کا اصرار جاری رہا۔

ناظم ندوۃ العلماء کا اصرار ۱۰ رمئی ۱۹۲۱ء (یکم رمضان ۱۳۳۹ھ) کو صاحبزادہ عبدالرحیم کا انتقال ہو گیا، ادھر ندوہ میں شیخ الحدیث کی جگہ خالی تھی مولانا سید امیر علی[1] کی وفات ہو چکی تھی اور شیخ محمد عرب بھی جا چکے تھے، اس موقع پر حکیم صاحب کو پھر مولانا کا خیال آیا، اور بڑے اصرار سے بلایا، اس مرتبہ وہ انکار نہ کر سکے، اس موقع پر ان کو اپنے محبوب استاد مولانا غلام احمد کی وصیت یاد آئی جو انھوں نے آخری بار بڑی تاکید کے ساتھ کی تھی مولوی صاحب

[1] مولانا سید امیر علی ملیح آباد ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے، علم و فضل میں بہت ممتاز تھے، خاص طور سے تفسیر و حدیث اور فقہ و اسماء الرجال پر ان کی نظر بڑی وسیع تھی تیس جلدوں میں مواہب الرحمن کے نام سے انھوں نے ایک بڑی جامع تفسیر لکھی فتاوی عالمگیری کی ضخیم جلدوں کا ترجمہ کیا اور عین الہدایہ کے نام سے ہدایہ کی شرح لکھی، یہ کتابیں نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہیں جہاں انھوں نے مدتوں عربی کتابوں کی تصحیح کا کام کیا تھا، مذکورۂ بالا کتابوں کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی لکھی تھیں جو زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکیں ان میں صحیح بخاری کی اردو شرح جو کئی جلدوں میں تھی نیز اسماء الرجال اور اصول فقہ پر چند کتابیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں، پتہ نہیں ان کتابوں کے مسودے اب کہاں ہیں۔

نول کشور پریس کی ملازمت کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرس مقرر ہوئے پھر ارکان ندوۃ العلماء نے

کا بیان ہے کہ میں جب واپس آنے لگا تو حسب معمول کچھ دور تک ساتھ آئے جب رخصت ہو کر آگے بڑھا تو پھر آواز دی میں حاضر ہوا تو فرمایا مولوی جی ایک نصیحت کرتا ہوں اسکا خاص خیال رکھنا، دیکھو حدیث شریف سے زیادہ اشتغال رکھنا، اور اس کے درس کو سرمایۂ سعادت سمجھنا۔ ناظم ندوۃ العلماء نے دار العلوم آنے کی دعوت دی اور خاص طور سے درس حدیث کی درخواست کی تو مولوی صاحب کو خیال ہوا کہ یہ خدا کی طرف سے استاد کی وصیت کی تعمیل کا موقع مل رہا ہے۔ یہ سوچ کر راضی ہو گئے اور منظوری کا خط لکھ دیا۔

ندوہ میں شیخ الحدیث

ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ (اگست ۱۹۲۱ء) میں لکھنؤ تشریف لائے اور ندوہ میں شیخ الحدیث مقرر ہوئے، اہل و عیال ساتھ نہیں تھے، سامان بھی زیادہ رکھنے کے عادی نہیں تھے، فرمایا کرتے تھے کہ آدمی کو ہلکا پھلکا رہنا چاہیے ملازمت کا کچھ اعتبار نہیں معلوم نہیں کس دن ملازم رکھنے والوں کا دل پھر جائے یا اپنا ہی جی نہ لگے آدمی کے ساتھ زیادہ جھمیلا نہ ہو گا تو آسانی سے اٹھ کھڑا ہو گا ورنہ زحمتیں پیش آئیں گی۔ ناظم صاحب نے درسگاہ ہی کے ایک

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳) انھیں دار العلوم کا مہتمم (پرنسپل) اور صدر المدرسین بنایا وہیں ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۸ء) میں ان کا انتقال ہوا، ایک صاحبزادی تھیں، جن کی شادی اپنی زندگی ہی میں شیخ خلیل بن محمد عرب سے کر دی تھی، رقیہ اور عطیہ انھیں کی یادگار ہیں، جو علمی اور ادبی صلاحیت میں امتیاز رکھتی ہیں، شیخ محمد محدث کبیر شیخ حسین یمانی کے صاحبزادہ تھے ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۷ء) میں یمن کے شہر حدیدہ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۴۴ھ (۱۹۲۵ء) میں بھوپال میں وفات پائی حدیث شریف اور عربی ادب میں خاص امتیاز تھا، ندوہ میں عرصہ تک استاد رہے، عربی کے بڑے قادر الکلام شاعر تھے الطراز الموشی فی فوائد الانشاء اور المورد الصافی فی العروض والقوافی، ان کی قابل ذکر تصانیف ہیں جس طرح وہ ایک عظیم باپ کے بیٹے تھے اسی طرح ایک لائق بیٹے شیخ خلیل بن محمد عرب سابق لکچرر لکھنؤ یونیورسٹی متوفی (۱۳۸۶ھ / ۱۹۶۶) کے باپ بھی تھے جنھوں نے باپ دادا کا نام بلند رکھا۔

حصہ میں قیام کا انتظام کر دیا، اور حدیث کی اونچی کتابوں کی تعلیم ان کے سپرد کر دی۔

اس زمانہ میں ندوہ کے مہتمم (پرنسپل) مولانا حفیظ اللہ صاحب[1] تھے، ان کو حدیث پڑھانے کا شوق تھا، صحیح مسلم ان کے پاس رہتی تھی، ان کا درس سادہ ہوتا تھا، حدیث کا مطلب بتا دیتے تھے لیکن مختلف فقہاء کے مذہب بیان کرنے اور ان کے دلائل فراہم کرنے سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ صحیح مسلم کے علاوہ صحیح بخاری، جامع ترمذی اور سنن ابی داود مولانا حیدر حسن خاں کے سپرد ہوئیں۔

---

[1] مولانا حفیظ اللہ مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلی کے نامور شاگرد تھے، بندی خورد ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم غازی پور میں مولانا عبد اللہ غازی پوری اور دوسرے علماء سے حاصل کی پھر لکھنؤ آکر مولانا عبد الحیٔ کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے، اور سند فراغت حاصل کی کچھ عرصہ تک کاکوری کے ایک اسکول میں مدرس رہے، پھر مولانا عبد الحیٔ نے لکھنؤ بلا کر اپنے داماد مولوی محمد یوسف کی تعلیم کی خدمت سپرد کی اُس کے بعد رام پور گئے اور مدرسۂ عالیہ میں استاد مقرر ہوئے وہاں نو سال نیک نامی کے ساتھ تعلیمی خدمات انجام دیں قیام رامپور کے زمانہ کے بہت سے واقعات سنایا کرتے تھے جنرل عظیم الدین خان کی شجاعت و بہادری سے بہت متاثر تھے اُن کے علاوہ دوسرے اعیان شہر کے حالات بیان کیا کرتے تھے ایک مرتبہ مولانا عبد الحق خیر آبادی سے مناظرہ بھی کیا تھا، اس کی روداد مزہ لے کر سناتے تھے، رام پور ہی میں تھے کہ ندوہ میں ان کی ضرورت محسوس ہوئی وہ ندوہ کی تحریک سے شروع ہی سے تعلق رکھتے تھے، اس کی حمایت میں ارشاد الکملاء ایک کتاب بھی لکھی تھی جس میں ندوہ کے مقاصد کی تائید اور مخالفین کے اعتراضات کا مدلل جواب دیا تھا۔ ناظم ندوۃ العلماء کی طلب پر وہ رام پور سے ندوہ آ گئے اور بہت عرصہ تک وہاں درس دیتے رہے، اس کے بعد ڈھاکہ کی طلبی ہوئی اور مدرسہ عالیہ میں استاد مقرر کیے گئے، نواب سلیم اللہ خاں سے بڑے تعلقات تھے، اسی زمانہ میں شمس العلماء کا خطاب ملا ۱۳۳۹ھ

امام ابوحنیفہ سے غیرمعمولی عقیدت

جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے، مولوی صاحب حنفی تھے، امام ابوحنیفہ سے ان کی عقیدت عشق کے درجہ تک پہونچ گئی تھی، اکثر خواب میں امام صاحب

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵) (سنہ ۱۹۳ء) میں ریٹائرڈ ہوگئے، اسی دوران حج بیت اللہ کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔ اسی زمانہ میں مولانا امیر علی کی وفات کے بعد ندوہ میں مہتمم اور صدر مدرس کی جگہ خالی تھی، ارکان ندوۃ العلماء نے اس منصب کے لیے مولانا حفیظ اللہ سے درخواست کی انھوں نے یہ پیشکش منظور کرلی اور لکھنؤ آگئے، اور دس سال کے قریب ندوہ کے پرنسپل رہے سنہ ۱۳۵۱ھ (سنہ ۱۹۳۱ء) میں کبرسنی کی وجہ سے اس خدمت سے علحدہ ہوگئے،

راقم الحروف ان کے آخری دور اہتمام میں ندوہ میں پڑھتا تھا، حجۃ اللہ البالغہ، صحیح مسلم اور تصریح الافلاک ان سے پڑھی تھیں، تصریح پر ان کا حاشیہ مشہور ہے، اور طلبہ کو اس سے بڑی امداد ملتی ہے۔ حدیث شریف سے ان کو دلی لگاؤ تھا، مولانا عبدالحئی سے حدیث کی کتابیں بھی پڑھی تھیں، ان کے یہاں بڑا توسع تھا، وہ حنفی تھے، مگر مقلد جامد نہ تھے، بلکہ دلائل پر نظر رکھتے تھے، اور جانب راجح کو ترجیح دیتے تھے، بعض مسائل میں حنفی مسلک سے ہٹ کر رائے قائم کی تھی، مولانا حفیظ اللہ کا ابتدائی تعلیمی ماحول بھی عدم تقلید کا تھا، مولانا عبدالحئی کی وسعت نظر اور ذوق تحقیق نے اور سہارا دیا، اور وہ بڑی حد تک اہل حدیث ہوگئے، لیکن اس بارہ میں بہت زیادہ شدت نہیں تھی، حنفیوں سے بھی حسن اخلاق کے ساتھ ملتے تھے، ان کے بہت سے دوست اور شاگرد حنفی تھے،

میں نے جس زمانہ میں ان سے پڑھا ہے، وہ خاصے سن رسیدہ ہوچکے تھے، لیکن قوی زیادہ کمزور نہیں تھے، بڑی سی داڑھی تھی لانبا قد چوڑا سینہ اور رنگ سانولا تھا، شیروانی پہنتے تھے، بڑے خوش پوش اور جامہ زیب تھے، دیکھنے میں بڑے وجیہ اور بارعب معلوم ہوتے تھے معقولات پر خاص نظر تھی، بعض شوقین طلبہ کو فلسفہ اور منطق کی اونچی کتابیں پڑھاتے تھے،

کی زیارت سے مشرف ہوتے رہتے تھے، کسی پیچیدہ مسئلہ میں جب دلائل خاطر خواہ سمجھ میں نہ آتے اور اس ادھیڑبن میں آنکھ لگ جاتی تو امام صاحب کو دیکھتے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶) حجۃ اللہ البالغہ بھی پڑھاتے تھے، مگر شاہ ولی اللہ کے حکیمانہ رنگ اور صوفیانہ ذوق سے زیادہ مناسبت نہیں تھی کبھی کبھی مولانا اسمٰعیل شہید کی عبقات بھی ان کے سپرد ہوجاتی، مگر تصوف سے انھیں دلچسپی نہیں تھی کہتے تھے مجھے تو حضرت ولی اللہ اور مجاہد شہید اسمٰعیل سے عقیدت ہے۔ حدیث کا درس سادہ ہوتا تھا، مباحث میں زیادہ نہیں پڑتے تھے، طلبہ مولانا حیدر حسن خان کے یہاں سے صحیح بخاری پڑھ کر آتے تھے اور حدیث و رجال کے فنی مباحث میں انھیں الجھانا چاہتے تھے، ان کو فقہاء احناف کے دلائل سنا کر محدثین کی طرف سے مدافعت پر مجبور کرتے تھے، مگر وہ ان جھمیلوں میں نہیں پڑتے تھے، اور مختصر جواب دے کر اگلی حدیث پڑھانے لگتے تھے، ندوہ کی تحریک میں شروع سے شریک تھے، لیکن قدیم نصاب تعلیم میں زیادہ قطع و برید کے موافق نہیں تھے، اسلئے مولانا شبلی سے اختلاف رکھتے تھے، ان کی عقلیت پسندی کو بھی پسند نہیں کرتے تھے، کبھی کبھی درجہ میں ان پر سخت تنقید کرنے لگتے تھے، تو ہم لوگوں کو ناگوار ہوتا تھا، ہمارے ایک دوست نیاز احمد مولانا شبلی کے عزیز اور ہم وطن ہیں، ایسے مواقع پر وہ زیادہ مدافعت کرتے تھے، تو فرماتے تم کیوں نہ بولو گے تم تو ہیڈ کوارٹر کے ہو ہم لوگ مولانا شبلی کی حمایت میں زیادہ حصہ لیتے تو کہتے وہ میرے دوست تھے، میں جو چاہوں کہوں تم لوگوں کو دخل دینے کا کیا حق ہے، لیکن اعتراض و تنقید کے باوجود مولانا شبلی کی اسلامی حمیت کی قدر کرتے تھے، ان کے بعض اشعار پڑھ کر کہتے کہ یہ ان کے لیے باعث مغفرت ہوں گے، ندوہ کے ارکان میں منشی احتشام علی مرحوم رئیس کاکوری ضلع لکھنؤ سے بڑا تعلق تھا،

اور کچھ ایسی باتیں ہوتیں یا ایسے حالات سامنے آتے جن سے ان کی الجھن دور ہوجاتی، اور حنفی مسلک کی صداقت عیاں ہوجاتی، پھر بیدار ہوتے تو کتب حدیث میں دلائل بھی نظر آجاتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہوتا، اور آپ کے ارشاد یا طرز عمل سے مسئلہ کی وضاحت ہوجاتی، بیداری کے بعد کتابوں میں تائیدی روایتیں بھی مل جاتیں۔ اس قسم کے واقعات بہت کم بیان

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷) جب تک لکھنؤ میں رہے ہر ہفتہ منشی صاحب کی کوٹھی ضرور جاتے، منشی صاحب مرحوم بھی ان کی بڑی عزت کرتے تھے، اپنے استاد مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی سے بڑی عقیدت تھی، کنز البرکات کے نام سے ان کی ایک سوانح عمری بھی لکھی تھی، ان کا ذکر بڑی محبت اور عظمت کے ساتھ کیا کرتے تھے، نواب صدیق حسن خاں ان کے ہم مسلک تھے، مگر مولانا عبدالحی صاحب سے ان سے جو تحریری مناظرہ ہوا تھا اس میں مولانا کو غالب سمجھتے تھے، استاد کی محبت کا یہ حال تھا کہ جب ان کے نواسہ مولانا محمد ایوب صاحب ان سے ملنے کے لئے آتے تو دیکھتے ہی کھڑے ہوجاتے، اس زمانہ میں استاد کی عزت وعظمت شاگرد کے دل میں پیوست ہوتی تھی، آج کی طرح تنخواہ دار ملازم نہیں سمجھا جاتا تھا۔

مولانا فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ سے بھی عقیدت تھی، ان کے جذبۂ اتباع سنت کی بڑی قدر کرتے تھے طالب علمی کے دور میں ملاقات کے لئے گنج مرادآباد بھی گئے تھے، اپنا ایک قلمی رسالہ نذر کیا تھا، جس میں یہ ثابت کیا تھا کہ وضو کے بعد رومال سے پانی پونچھنا نہ چاہئے، مولانا نے رسالہ پر ایک نظر ڈالی، اور فرمایا کچھ حرج نہیں، پھر فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور فرما رہے ہیں کہ کوئی حرج نہیں ہے، مولانا حفیظ اللہ صاحب نے عرض کیا، حضرت یہ آپ کا کشف ہے یہ ہمارے لیے حجت نہیں ہے، کہتے تھے اس جواب سے مولانا

کرتے تھے، زیادہ تر اخفائے حال کی کوشش کرتے تھے، مگر کبھی کبھی درس میں بحث کے دوران کسی خواب یا مکاشفہ کا ذکر آجاتا۔

مسلک مولانا نے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی تھی وہ حنفی نہ تھے، میاں نذیر حسین تو کھلے ہوئے غیر مقلد تھے، لیکن شیخ حسین بھی حنفی مسلک سے تعلق نہ رکھتے تھے، وہ ائمۂ مذاہب کا احترام کرتے تھے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام ادب سے لیتے تھے، مگر خود شافعی تھے۔ اس لئے ان کے درس میں احناف کے دلائل کا وہ زور نہ تھا، جس کی ایک حنفی سے توقع کی جاتی ہے۔ حدیث کی درسی کتابیں بھی عموماً محدثین یا شوافع کی لکھی ہوئی ہیں، ان کے مصنفین کو حنفیوں کے دلائل جمع کرنے کی کوئی خاص فکر نہیں تھی، ان کے سادہ مطالعہ کا اثر یہی ہوتا ہے کہ احناف کا مسلک کمزور معلوم ہوتا ہے۔ مولوی صاحب نے لاہور میں مولانا غلام احمد سے فقہ واصول فقہ کی کتابیں توجہ سے پڑھی تھیں، بچپن سے جن بزرگوں اور استادوں کی خدمت میں رہے وہ بھی حنفی تھے۔ اس خاندانی اور تعلیمی ماحول نے ان کے دل میں امام ابوحنیفہؒ سے غیر معمولی محبت وعقیدت پیدا کردی تھی اور انھیں احناف کی صداقت اور ان کے مسلک کی قوت کا یقین ہوگیا تھا، اگر حدیث کے استاذ حنفی ہوتے تو ان کی زبان سے اپنے خیالات کی تائید سن کر مطمئن ہوجاتے اور خود کسی کاوش

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸) فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ بہت خوش ہوئے، اور فرمایا تم نے ٹھیک کہا تم کو یہی کہنا چاہئے تھا۔

اتباع سنت کا خاص اہتمام تھا، نماز بڑے خشوع وخضوع سے پڑھتے، فجر کی نماز اول وقت اندھیرے میں شروع کرتے، قرأت طویل ہوتی، اور رکوع سجدہ اتنی دیر تک کرتے کہ لوگ اس حالت میں وضو کرتے پھر بھی رکوع مل جاتا، عصر کی نماز ایک مثل پر پڑھتے مغرب میں عجلت سے

میں مبتلا نہ ہوتے، مگر غیر حنفی اساتذہ کے درس میں ان کے سامنے حنفیوں کے جو دلائل آتے وہ زیادہ مضبوط نہ ہوتے۔ امام ابو حنیفہ کے ساتھ انھیں جو والہانہ عقیدت تھی وہ مجبور کر دیتی کہ خود ان کی تائید میں دلائل تلاش کریں، ان دلائل کو محدثین کے معیار پر جانچیں، اور ائمہ جرح و تعدیل کے بیانات سے راویوں کی ثقاہت ثابت کریں، بھوپال میں شیخ حسین کے یہاں انھیں اس کا پورا موقع ملا حدیث کے متون اور ان کی مفصل شرحیں وہاں موجود تھیں، اسماء الرجال کی کتابوں کا بھی کافی ذخیرہ تھا، اور اصول حدیث کی متداول کتابوں کے علاوہ نادر مخطوطے بھی موجود تھے۔ کہیں مطالب کے سمجھنے میں اشکال ہوتا تو وسیع النظر اور شفیق استاد کی اعانت ہر قدم پر حاصل تھی، میاں صاحب کے درس میں مولوی صاحب نے جو یہ دعوی کیا تھا، کہ میں عالم پٹھان ہوں، اس کو انھوں نے بھوپال کے قیام کے زمانہ میں صحیح ثابت کر دیا۔

طریقۂ درس عموماً حدیث شریف کے درس میں طلبہ عبارت پڑھتے ہیں، پھر استاد مطالب و مباحث پر مفصل و مدلل تقریر کرتا ہے، اور اپنے بیان کے ثبوت میں جہاں ضرورت محسوس ہوتی ہے کتابوں کے حوالے دیتا ہے، کبھی کبھی کسی کتاب کو کھول کر دکھا بھی دیتا ہے، طلبہ استاد کی تقریر توجہ سے سنتے ہیں جو بات سمجھ میں نہیں آتی اسے استاد کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، اگر کوئی بات وضاحت طلب ہوتی ہے تو استاد اسے واضح کر دیتا ہے، لیکن مولانا کا طریقۂ درس اس سے بالکل مختلف تھا، طلبہ کے سامنے عبارت کی تشریح، مطالب کی توضیح اور مباحث کی تفسیر ہی نہیں پیش کرتے تھے،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹) کام لیتے، ان کا یہ معمول زندگی بھر رہا، اور ضعف و کبر سنی کے زمانے میں بھی اس میں فرق نہیں آیا۔

بلکہ طلبہ کو ماخذ سے بھی واقف کراتے تھے، ان کے مراتب ذہن نشین کراتے، ان کے مطالعہ کے آداب بتاتے، اور ان سے استفادہ کا سلیقہ سکھاتے تھے، ماخذ و مراجع پورے طور پر ان کی نظر میں ہوتے تھے، درسگاہ میں اپنے قریب حوالہ کی کتابیں رکھ لیتے، اور جب مسئلہ پر بحث شروع ہوتی، تو وہ اپنی تقریر کے ساتھ ساتھ یہ کتابیں طلبہ کے حوالہ کرتے تھے، اکثر کہتے تھے کہ انھیں خود پڑھو، اس سلسلہ میں صرف شروح پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اونچے سے اونچے ماخذ طلبہ کے سامنے پیش کر دیتے تھے، مثلاً صحیح بخاری میں اگر کوئی اختلافی مسئلہ آجاتا تو صرف فتح الباری اور عینی ہی پر بس نہ ہوتی بلکہ امام شافعی کے نقطۂ نظر کو سمجھانے کیلئے ان کی کتاب الام پڑھاتے۔ امام مالک کے دلائل کے لئے مدونہ اور اس کی شرح پیش کرتے اگر کبھی کوئی طالب علم درمیان میں کسی متاخر مصنف کا حوالہ دیتا مثلاً کہتا کہ اس بارے میں شاہ ولی اللہؒ نے یہ لکھا ہے یا مولانا عبد الحیؒ کی یہ رائے ہے، شاہ عبد الحق نے یہ کہا ہے تو فرماتے کہ متاخرین کا ذکر اس موقع پر کیوں کر رہے ہو، صحیح بخاری ہمارے سامنے کھلی ہے، کتاب الام اور مدونہ یہ رکھی ہیں، متقدمین کی ان کتابوں کی موجودگی میں پچھلے آدمیوں کے حوالہ کی کیا ضرورت ہے۔ مولوی صاحب ہمیشہ کہتے تھے کہ جس وقت دلائل پیش کئے جا رہے ہوں اس وقت اشخاص کا نام نہ لیا کرو، حنفی مسلک کی تائید کے لیے وہ کبھی کسی حنفی مصنف کا حوالہ نہیں دیتے بلکہ عموماً محدثین کی کتابوں ہی سے دلائل فراہم کرتے۔ نکات اور توجیہات کی طرف زیادہ میلان نہیں تھا، بلکہ انداز بحث بالکل محدثانہ ہوتا تھا۔ مطالعہ اتنا وسیع اور عمیق تھا کہ جن ابواب میں گمان بھی نہیں ہوتا تھا، ان سے وہ اپنے مسلک کی تائید میں روایت نکال لیتے تھے، نماز کے اوقات، صلح حدیبیہ میں صحابہ کی تعداد، تراویح کی رکعات، صاع کی مقدار، تین طلاقوں کے حکم اور اسی طرح

بیسیوں مسائل میں ان کی تلاش وتحقیق ان کی وسعت نظر کا پتہ دیتی تھی، تحقیق کے میدان میں اپنے ہوں یا غیر کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے، اور نہ عقیدت کی بنا پر بے دلیل کسی کا دعوی تسلیم کرتے تھے، امام شوکانی ان کے سلسلۂ سند میں تھے، صرف دو واسطوں سے شاگرد تھے، لیکن بایں ہمہ ان سے بالکل مرعوب نہیں تھے، مذاہب کے بیان میں دلائل پر ایک نظر پڑ جانے کے لیے نیل الاوطار طلبہ سے پڑھاتے، لیکن ساتھ ساتھ اسکی کمزوریاں بھی واضح کرتے جاتے۔

سلسلۂ بحث میں اصول حدیث کے مباحث بھی زیر بحث آجاتے، اس بارے میں بھی ان کا ذوق بہت بلند تھا، اصول حدیث کی متداول کتابوں کے علاوہ نادر قلمی نسخے بھی ان کے پیش نظر ہوتے، اصولی مسائل مین بھی ان کا طریقہ وہی تھا کہ طلبہ کو خود سمجھنے اور رائے قائم کرنے کا موقع حاصل ہونا چاہیے، کہا کرتے تھے کہ پہلے مخالف کے دلائل پورے طور پر سمجھ لو، اور انھیں دوسروں کی زبان سے سننے کے بجائے خود مخالفین ہی سے معلوم کرنا چاہیے، فرماتے تھے کہ براہ راست ان کی کتابوں کے مطالعہ کے بجائے جو لوگ ثانوی ذرائع سے معلومات حاصل کرتے ہیں بسا اوقات انھیں دھوکا ہوتا ہے، اور وہ مخالفین کی طرف ایسے خیالات منسوب کر دیتے ہیں جنھیں وہ تسلیم نہیں کرتے، طلبہ کو بڑی تاکید کرتے تھے کہ جس شخص کی تردید کر رہے ہو پہلے خوب تحقیق کر لو کہ اس کے اصل خیالات کیا ہیں، اسی بنا پر انھیں اپنے مسلک سے اختلاف رکھنے والوں کی تصانیف کی زیادہ فکر رہتی تھی، جہاں تک ممکن ہوتا، ان کی کتابیں حاصل کرتے اور شاگردوں کو ان کے مطالب اور دلائل سے مطلع کرتے، فرمایا کرتے تھے کہ میں چاہتا ہوں کہ تمھارے سامنے مخالفین کے دلائل اور ان کے ماخذ وضاحت کے ساتھ آجائیں تاکہ تمھیں کبھی یہ گمان نہ ہو کہ مولوی صاحب

اپنے مسلک کی کمزوری کی وجہ سے مخالفین کے دلائل چھپا گئے، ان کی اس نصیحت سے ان کے شاگردوں کو بے حد فائدہ پہونچا، اور بے تحقیق بات کہنے کی عادت نہیں پڑی، مولانا کے درس میں عجیب سماں ہوتا تھا، حدیث کے بڑے بڑے ائمہ کے خیالات سامنے آتے تھے، اور ان کی اہم تصانیف اور ان کے طرز استدلال سے واقفیت ہوتی تھی، وہ حنفی مسلک کو اتنا مدلل کر دیتے کہ پھر کسی دوسرے کی تحقیق نگاہ میں جچتی نہیں تھی،

اسماء الرجال کی کتابوں پر بھی ان کی بڑی گہری نظر تھی، یہاں بھی وہ متقدمین کی تصانیف کی فکر میں رہتے تھے، میزان الاعتدال، تہذیب التہذیب، تذکرۃ الحفاظ اور لسان المیزان کے اقوال تنقیدی نظر سے پڑھتے تھے، اور متقدمین کی کتابوں میں ان کی سند تلاش کرتے تھے، کہتے تھے کہ آٹھویں نویں صدی کے آدمیوں کا بیان پہلی اور دوسری صدی کے اشخاص کے بارہ میں اسوقت قابل قبول ہو سکتا ہے، جب اسکا ثبوت معاصرین کے یہاں مل جائے، فرماتے تھے، کہ راوی کی توثیق وتضعیف اور حدیث کی صحت وضعف خود ایک اجتہادی مسئلہ ہے، ہو سکتا ہے کہ کسی راوی کو ایک محدث کسی وجہ سے ضعیف سمجھتا ہو، اور دوسرے کے نزدیک وہ وجہ باعث ضعف نہ ہو، یہی حال حدیث کی صحت وضعف کا ہے، اس لیے اسماء الرجال کی کتابوں میں صرف قوی وضعیف اور ثقہ وغیرہ ثقہ دیکھ کر فیصلہ کر دینا محقق کی شان نہیں ہے، بلکہ راوی کے حالات کا تفصیل سے مطالعہ ضروری ہے، اسی طرح علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر کے نزدیک، اگر کوئی راوی مجہول ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو متقدم مجتہد اس سے روایت کر رہا ہے، وہ بھی اس سے ناواقف ہو، ایک صاحب علم ونظر مجتہد جب کسی روایت پر اپنے مذہب کی بنیاد رکھتا ہے تو وہ روایت اس کے نزدیک ضرور صحیح ہوگی۔

ورنہ وہ اسے اپنے استدلال کی بنیاد کیوں بناتا، جان بوجھ کر ایک ضعیف روایت کو ماخذ بنانا، اور ایک غیر معتبر راوی پر اعتبار کرنا مجتہد کی شان ہی کے خلاف نہیں ہے، بلکہ دیانت کے بھی خلاف ہے، فرمایا کرتے تھے، کہ بسا اوقات لوگ اشخاص کے علم سے مرعوب ہو کر تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھتے یا فرطِ عقیدت کی بنا پر بے چون وچرا اس کی بات مان لیتے ہیں، اس لیے غلطی کا ازالہ نہیں ہو پاتا، مثلاً صحیح بخاری میں حضرت ابوبکرہؓ کی ایک روایت ہے،

لقد نفعنی اللہ بکلمۃ سمعتہا	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں
من رسول اللہ علیہ وسلم	نے ایک بات سنی تھی، اس نے مجھے
ایام الجمل بعد ما کدت	جنگ جمل کے زمانہ میں فائدہ پہنچایا
ان الحق باصحاب الجمل فا	قریب تھا کہ میں جمل والوں کے
قاتل معھم قال لما بلغ	ساتھ شامل ہو جاؤں اور ان کے
النبی صلی اللہ علیہ وسلم	ساتھ جنگ میں شریک ہو جاؤں،
ان اھل فارس قد ملکوا	(وہ بات یہ ہے) کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم
علیھم بنت کسریٰ قال	کو اطلاع ملی کہ اہل فارس نے کسریٰ
لن یفلح قوم ولوا امرھم	کی لڑکی کو اپنا حکمران بنایا ہے تو فرمایا
امرأۃ[1]	وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہو گی جس نے
	اپنا حکمران ایک عورت کو بنایا۔

[1] صحیح بخاری ابواب المغازی۔ کتاب الفتن میں بھی یہ روایت الفاظ میں کسی قدر فرق کے ساتھ موجود ہے، صحاح کی دوسری کتابوں میں بھی مذکور ہے، لیکن بخاری کی اہمیت سب سے زیادہ ہے،

(باقی)

کلامِ اقبال میں عورت کا درجہ

از

جناب جگن ناتھ صاحب آزاد

صنفِ نازک کے بارے میں اقبال کے نظریات اقبال کے اس نظامِ فکر کا ایک حصہ ہیں، جو سارے سماج کے بارے میں اقبال نے پیش کیا ہے، ہم اقبال کے نظریے سے متفق ہوں یا نہ ہوں یہ ایک حقیقت ہے کہ اقبال نے سماج کے ایک مضبوط کردار پر زور دیا ہے، اور اس مضبوط کردار کے سارے قلعہ کا سنگ بنیاد اقبال نے عورت کے کردار کو قرار دیا ہے، لہٰذا کلام اقبال میں عورت کی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے اس قسم کے جملے قطعاً بے معنی ہیں کہ عورت کے بارے میں اقبال کے نظریات رجعت پسندانہ ہیں، یا ترقی پسندانہ، جدید ہیں یا قدیم؟ اقبال سماجی نظام کے بارے میں جو نظریات ۱۹۳۸ء میں پیش کر کے دنیا سے رخصت ہو گئے، انھیں ۱۹۷۵ء کے پیمانے سے ناپ کر کے صحیح یا غلط قرار دینا اتنی ہی لغو بات ہے، خاص طور پر یہ دیکھتے ہوئے، کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد حالات کی رفتار اتنی تیز ہو گئی ہے، کہ اس جنگ کے بعد کی چوتھائی صدی نے اس سے قبل کی ایک صدی کے مقابلہ میں زیادہ منزلیں طے کی ہیں،

یہ کہنے کی ضرورت مجھے اس لئے بھی پیش آئی ہے کہ آج کل ہندوستان میں بعض نقادِ اقبال کو سیکولرزم اور متحدہ قومیت کا علمبردار ثابت کرتے ہوئے شعوری یا غیر شعوری طور پر اقبال کو اس کے بنیادی سرچشمۂ افکار — اسلام — سے بے تعلق ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف

نظر آتے ہیں، ان نقادوں کو اس بات سے سروکار نہیں کہ یہ عمل جائزہ و تحقیق کی پختگی یا خامی کو
ظاہر کرتا ہے، اس کاوش کا دوسرا ضرر رساں پہلو یہ ہے کہ اقبال کی شاعری جو ہمارے مطالعے
کا موضوع ہونا چاہئے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی جارہی ہے، اور توجہ صرف اس بات
پر مرکوز ہو رہی ہے، کہ اقبال جس نے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کا ترانہ لکھا
مشترکہ قومیت کا علمبردار ہے، اور اسے ہندوستان میں اپنا کھویا ہوا مقام واپس ملنا چاہئے"
چاہتا میں بھی یہی ہوں لیکن اپنے مطالعے میں اتنا اضافہ ضرور کروں گا کہ اقبال مشترکہ قومیت
کے علمبردار ہوں یا نہ ہوں (اور غالباً مشترکہ قومیت سے ہم آج جو کچھ مراد لے رہے ہیں،
اقبال اس کے علمبردار نہیں ہیں) ان کو اس لئے ہندوستان میں کھویا ہوا مقام واپس ملنا چاہئے
کہ وہ ہمارے ایک عظیم شاعر ہیں، اور عظیم شاعر ہونے کی حیثیت سے ان کو ہماری اس
وکالت کی قطعاً ضرورت نہیں کہ انھوں نے ع

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"

لکھا۔ انھوں نے

"مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا"

بھی لکھا، اور یہ بھی لکھا

تجھ کو چھوڑا کہ رسول عربی کو چھوڑا ۔۔۔ بت گری پیشہ کیا بُت شکنی کو چھوڑا؟

ہم نشیں مسلم ہوں میں توحید کا حامل ہوں میں
اس صداقت پر ازل سے شاہد عادل ہوں میں

اور یہ بھی اقبال کی ساری شاعری کی طرح عظیم شاعری کی مثالیں ہیں، اور چونکہ
انھوں نے ہمیں عظیم شاعری دی ہے، اس لئے ہماری زبان اور ادب میں ان کو ایک

رفیع مقام حاصل ہے، ان سے اس مقام کو چھیننے کی کوشش کرنا ہماری ادب شناسی پر نہیں، ادب
ناشناسی پر دلالت کرتا ہے،

(۲)

آخر الذکر دو اشعار کا ذکر اس مقالے میں اس لئے بھی ضروری ہے کہ کلام اقبال میں
عورت کی حیثیت پر بحث کرنے کے لئے اس ماحول کا تعین ضروری ہے، جس میں اقبال کے سماجی
نظریات و افکار نے پرورش پائی،

ترک شاعر ضیاء، اقبال کے محبوب شاعر تھے، اور کئی محفلوں میں انھوں نے اس کا
کلام بڑے والہانہ انداز سے پڑھا (اگر میں غلطی نہیں کرتا تو انھوں نے جامعہ ملیہ کی ایک محفل میں
بھی جب کہ وہ پروفیسر مجیب کے مہمان تھے، ضیاء کا کلام سنایا تھا)، ضیاء کے قومی افکار
کی تعریف انھوں نے اپنی اکثر تحریروں میں جی بھر کر کی ہے، لیکن "اسلام میں افکار الٰہیہ کی
تشکیل جدید" میں عورت کے متعلق ضیاء کے نظریات پر بحث کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں،

"مرد اور عورت میں مساوات دیکھنے کے مشتاق ہیں۔ وہ (ضیاء) احکام
اسلام کے خاندانی نظام میں جو آج مروج ہے، انتہا پسندانہ تبدیلیاں دیکھنے
کا متمنی ہے،

وہ لکھتا ہے:۔

"عورت میری ماں ہے، میری بہن یا میری بیٹی ہے، یہ عورت ہی ہے جو
میری روح کی گہرائیوں میں انتہائی پاکیزہ جذبات ابھارتی ہے!

"عورت میری محبوبہ بھی ہے، میرا سورج، میرا چاند اور میرا ستارہ
ہے"

"یہ عورت ہی ہے جس کے طفیل میں زندگی کی شاعری کو سمجھتا ہوں، یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا کا مقدس قانون اس خوبصورت مخلوق کو ذلیل اور حقیر سمجھے، یقیناً علماء نے قرآن کی تفسیر میں کوئی نہ کوئی غلطی کی ہے"۔

قوم اور ملک کی بنیاد خاندان ہے:۔

"جب تک کسی قوم کو عورت کی پوری قدر وقیمت کا احساس نہیں ہو جاتا، قومی زندگی نامکمل ہی رہتی ہے،

خاندان کی تربیت اور پرورش منصفانہ انداز سے ہونا چاہیے،

اس لئے تین چیزوں میں مساوات کا ہونا ضروری ہے، اور وہ ہیں — طلاق، علیحدگی اور وراثت،

جب تک وراثت کے قانون کی رو سے عورت مرد کا نصف اور شادی کے قانون کی رو سے مرد کا ایک چوتھائی تصور کی جاتی رہے گی، اس وقت تک نہ تو خاندان ترقی کر سکے گا، اور نہ ملک، جہاں تک دوسرے حقوق کا تعلق ہے، ہم نے قومی عدالتیں قائم کر دی ہیں، دوسری طرف خاندان کو ہم نے اسکول کے حوالے کر رکھا ہے،

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ہم نے عورت کو کیوں فراموش کر دیا ہے، کیا وہ ملک کے لئے کام نہیں کرتی، ؟ کیا ہم اس وقت کا انتظار کر رہے ہیں، جب وہ اپنی (کپڑے سینے والی) سوئی کو ایک سنگین میں تبدیل کر کے ایک انقلاب پیدا کرے، اور اس سنگین کے زور سے اپنے حقوق ہمارے ہاتھوں سے زبردستی چھین لے"

ضیا کے یہ افکار نقل کرنے کے بعد اقبال ان افکار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"میں یہ پوچھتا ہوں کہ جس مساوات کا مطالبہ ضیا نے کیا ہے یعنی طلاق، علیحدگی اور وراثت میں مساوات، کیا وہ مساوات شریعت محمدی کی رو سے بھی ممکن ہے، میں نہیں جانتا کہ کیا ترکی میں عورتوں کی بیداری نے ایسے مطالبات پیدا کر دیئے ہیں جو بنیادی اصولوں کی از سر نو تفسیر کئے بغیر پورے نہیں ہو سکتے، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ پنجاب میں ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں، جب کہ وہ مسلمان عورتیں جو اپنے غیر پسندیدہ شوہروں سے نجات پانا چاہتی تھیں، اپنا مذہب ترک کرنے پر مجبور ہو گئیں، یہ صورت حال ایک تبلیغی مذہب کے مقاصد کے ساتھ قطعاً ہم آہنگ نہیں،......

جہاں تک ترک شاعر کے مطالبات کا تعلق ہے، غالباً احکام اسلام کے خاندانی نظام سے متعلق اس کی واقفیت زیادہ نہیں ہے، نہ ہی غالباً وہ وراثت کے قرآنی حکم کی اقتصادی اہمیت کو سمجھتا ہے،

اس کے بعد اقبال نے اس بحث میں شریعت کے ان پہلوؤں پر مفصل روشنی ڈالی ہے، جن کا تعلق اسلام میں عورت کی حیثیت کے بارے میں ہے۔

تو گویا اقبال نے اپنی نظم ونثر میں عورت کا سماجی مقام متعین کرنے میں بنیادی طور پر اپنے افکار کو اس نظام کے تابع رکھا ہے، جو انھیں احکام قرآنی میں نظر آیا ہے کیونکہ اقبال کے نزدیک عورت کی یہی حیثیت برقرار رکھنے ہی سے ہمارا معاشرہ ان تمام عیوب سے پاک ہو سکتا ہے، جو موجودہ دور نے عورت کے نئے کردار کی صورت میں ہمارے معاشرے کو دیئے ہیں،

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے ‌ ‌ ‌ روشن ہے نگہ آئینۂ دل ہے مکدر

بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے — ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر

خلوت میں خودی ہوتی ہے خودگیر و لیکن — خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسّر

اقبال کے قلم سے ترک شاعر ضیا کے افکار کی تردید جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، ۱۹۳۶ء یا ۱۹۳۷ء کی بات ہے، اس سے دس برس قبل ۱۹۱۸ء میں اقبال کا دوسرا مجموعۂ کلام "رموزِ بے خودی"[1] چھپا، اس میں ارکانِ اساسی ملیہ اسلامیہ (رکن اول، توحید، رکنِ دوم۔ رسالت) ایک طویل بحث ہے، اس بحث کی تین نظمیں عورت کے موضوع پر ہیں؛

۱- اس معنی میں کہ بقائے نوع کا سبب امومت ہے اور حفظ و احترام امومت اصل اسلام ہے،

۲- اس معنی میں کہ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء اسلام کے لئے اسوۂ کاملہ ہیں، اور

۳- خطاب بہ مخدراتِ اسلام،

پہلی نظم میں آپ کہتے ہیں:-

نغمہ خیز از زخمۂ زن سازِ مرد — از نیازِ او دو بالا نازِ مرد

پوششِ عریانیٔ مرداں زن است — حسن دلجو عشق را پیراہن است

عشقِ حق پروردۂ آغوشِ او — ایں نوا از زخمۂ خاموشِ او

آں کہ نازد بر وجودش کائنات — ذکرِ او فرمود با طیب و صلوٰۃ

مسلمے کو را پرستارے شمرد — بہرہ از حکمتِ قرآں نبرد

نیک اگر بینی امومت رحمت است — زانکہ اورا با نبوت نسبت است

شفقتِ او شفقتِ پیغمبر است — سیرتِ اقوام را صورت گر است

[1] بعد میں "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" دونوں مل کے ایک ہی کتاب کی صورت میں "اسرار و رموز" کے نام سے شائع ہوئیں،

از امومت پختہ تر تعمیرِ ما — در خطِ سیمائے او تقدیرِ ما

ہست اگر فرہنگِ تو معنی رسے — حرفِ امت نکتہ ہا دارد بسے

گفت آں مقصودِ حرفِ کن فکاں — زیرِ پائے امہات آمد جناں

آں دخِ دہستانی زادے جاہلے — پست بالائے سطبرے بد گلے

نا تراشے پروردش نا زادۂ — کم نگاہے کم زبانے سادۂ

دل ز آلامِ امومت کردہ خوں — گردِ چشمش حلقہ ہائے نیلگوں

ملت ار گیرد ز آغوشش بدست — یک مسلمانِ غیور و حق پرست

ہستیِ ما محکم از آلامِ اوست — صبحِ ما عالم فروز از شامِ اوست

تصویر کا یہ تابناک پہلو پیش کرنے کے بعد اقبال اس کا سنولایا ہوا پہلو بھی ہمارے سامنے لاتے ہیں، اور کہتے ہیں:

واں تہی آغوشِ نازک پیکرے — خانہ پروردے نگاہش محشرے

فکرِ او از تابِ مغرب روشن است — ظاہرش زن باطنِ او نازن است

بند ہائے ملتِ بیضا گسیخت — تا ز چشمش عشوہا حل کردہ ریخت

شوخ چشم و فتنہ زا آزاد ویش — از حیا نا آشنا آزاد ویش

علمِ او بارِ امومت بر نتافت — بر سرِ شامش یکے اختر نتافت

ایں گل از بستانِ ما نارستہ بہ

داغش از دامانِ ملت شستہ بہ

اس دوسرے رُخ کی ایک جھلک "ضربِ کلیم" میں بھی یوں نظر آتی ہے؛

آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے — وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے — ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال — مرد بیکار و زن تہی آغوش ؟

کلام اقبال میں موضوع کوئی بھی ہو، ذہن بے اختیار اُس کے کمالِ فن کی طرف جاتا ہے۔ مذکورہ بالا قطعہ کوئی بہت اعلیٰ شاعری کی مثال نہیں، یہی خیال "ضرب کلیم" سے قبل جاوید نامہ میں انتہائی دلکش بلکہ ساحرانہ انداز سے ہمارے پاس آ چکا ہے۔ پس منظر فلک مریخ ہے، اقبال اور رومی ہزاروں کاخ و کوئے سے گذر کر شہر مرغدین سے باہر ایک میدان میں پہنچے" ہیں۔ "اس میدان میں عورتوں اور مردوں کا ایک ہجوم ہے، اور اس ہجوم میں ایک عورت کھڑی ہے، اور اس کا قد انار کے بوٹے کا سا ہے، اور وہ تقریر کر رہی ہے، اس کا چہرہ ہے نور روشن لیکن روح کے نور کے بغیر ہے، اور اس کے معانی اس کے بیان پر گراں گذر رہے ہیں، اس کی گفتگو بے سوز اور آنکھ بے نم ہے، اور وہ خود آرزو کے سرور سے نامحرم ہے، اس کا سینہ جوشِ جوانی سے قطعاً خالی ہے، اور اُس کا آئینہ اندھا اور صورت ناپذیر ہے، وہ عشق اور آئینِ عشق سے بے خبر ہے، وہ ایک ایسی چڑیا ہے جسے شاہینِ عشق نے رد کر دیا ہے،

اب وہ حکیم مریخی، حکیم نکتہ دان، رومی اور اقبال سے کہتا ہے کہ "یہ دوشیزہ اہل مریخ میں سے نہیں ہے، یہ دراصل ایک سادہ و آزادہ و بے ریو و رنگ" عورت تھی، فرزمرز اسے یورپ سے چرا لایا، اور اسے نبوت کے کام میں پختہ کر کے جہانِ مریخ میں چھوڑ دیا۔ اب یہ کہتی ہے کہ میں آسمان سے نازل ہوئی ہوں اور میری دعوت دعوتِ آخر زماں ہے، یہ عورت مرد و زن کے باہمی تعلقات کے بارے میں بات چیت کرتی ہے، اور بدن کے رازوں کو زیادہ واضح طریقے سے بیان کرتی ہے، اس آخر الزماں کے نزدیک "تقدیر زیست کیا ہے؟" اہلِ زمین

کی زبان میں اس طرح بیان کرتا ہے،

اے زناں! اے مادراں! اے خواہراں! — زیستن تا کے مثالِ دلبراں ؟

دلبری اندر جہاں مظلومی است — دلبری محکومی و محرومی است

در دو گیسو شانہ گردانیم ما — مرد را نخچیر خود دانیم ما

مرد صیادے بہ نخچیری کند — گرد تو گردد کہ زنجیرے کند

گرچہ آں کافر حرم سازد ترا — مبتلائے درد و غم سازد ترا

ہمبر او بودن آزارِ حیات — وصلِ او زہرے و فراقِ او نبات

مار پیچاں از خم و پیچش گریز — زہرہایش را بخونِ خود مریز

از امومت زرد روئے مادراں

اے خنک آزادیِ بے شوہراں

وحی یزداں پے بہ پے آید مرا — لذتِ ایماں بیفزاید مرا

آمد آں وقتے کہ از اعجازِ فن — می تواں دیدن جنیں اندر بدن

حاصلے برداری از کشتِ حیات — ہر چہ خواہی از بنین[1] و از بنات

گر نباشد بر مرادِ ما جنیں — بے محابا کشتنِ او عین دیں

در پسِ این عصر اعصارِ دگر — آشکارا گردد اسرارِ دگر

پرورش گیرد جنیں نوعِ دگر — بے شبِ ارحام دریابد سحر

تا بمیرد آں سراپا اہرمن — ہمچو حیوانات ایامِ کہن

---

[1] بنین اور بنون ابن کی جمع ہے، الف گر گیا ہے، رفع کی حالت میں بنون اور نصب و جر کی حالت میں بنین استعمال ہوتا ہے۔

لالۂ بے داغ و بادامان پاک — بے نیاز از شبنمے خیزد ز خاک

خود بخود بیروں فتد اسرار زیست — نغمہ بے مضراب بخشد تار زیست

آنچہ از فیضان فرو ریزد مگیر — اے صدف در زیر دریا تشنہ گیر

خیزد با فطرت بیا اندر ستیز — تا ز پیکار تو حُر گردد کنیز

رستن از ربط دو تن توحید زن

حافظ خود باش و بر مردان مستن

اسلامی قانون کے رو سے سماج میں عورت کی حیثیت سے متعلق اقبال کا نظریہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اس نظریہ کے پیش نظر اقبال کے یہاں نبیۂ مریخ کا جو خود اقبال ہی کے ذہن دراک کی اختراع ہے، رد عمل ڈھونڈنا دشوار نہیں ہے، "اسلام میں افکار الٰہیہ کی تشکیل جدید" میں مذکورہ ترک شاعر کے نظریے کو ہدف تنقید بناتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"قانون وراثت کے بارے میں شاعر نے جو اصلاح تجویز کی وہ اس کی غلط فہمی پر مبنی ہے، لڑکے اور لڑکی کے قانونی حصوں میں عدم مساوات کی موجودگی سے یہ فرض نہیں کر لینا چاہئے کہ اسلامی قانون مرد کو عورت پر ترجیح دے رہا ہے؟ اس قسم کا مفروضہ روح اسلام کے منافی ہے، قرآن کہتا ہے:-

"عورتوں کو مردوں پر وہی حقوق حاصل ہیں جو مردوں کو عورتوں پر،"

لڑکی کے حصہ کا تعین اس بنا پر نہیں ہوتا کہ وراثت میں اسے کمتر سمجھا گیا ہے بلکہ یہ فیصلہ اس کے اقتصادی مواقع اور اس مقام کو پیش نظر رکھ کے کیا گیا ہے جو اس موجودہ سماجی نظام میں جس کا وہ ایک جزو ہے حاصل ہے

یہ تو مسئلے کا صرف ایک پہلو ہے، اس مسئلے کے جس قدر بھی پہلو ہیں، انھیں اقبال نا شریعت

اسلامی کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں، ایک پہلو وہ ہے جسے اقبال نے خود ساختہ نبیۂ مریخ کی بات چیت میں لاکر انتہائی دلکش شاعری بنا دیا ہے، در اصل نبیۂ مریخ کے نظریات سے اقبال کو شروع ہی سے ایک چڑھ سی ہے، "بانگ درا" کے ظریفانہ کلام میں بہت پہلے انھوں نے لکھا:

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی — قوم نے ڈھونڈ لی فلاح کی راہ

روش مغربی ہے مدنظر — وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ

یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین

پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

لیکن در اصل یہ چڑھ اس نظام سے ہے جس نے عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں اس طرح لاکے کھڑا کیا کہ گھریلو زندگی کی شکست و ریخت ہو کر رہ گئی، اس نظریے میں نطشے کا وہ جذبہ دور دور تک نظر نہیں آتا، جو عورت ذات کی مخالفت اور اس کے ساتھ نفرت پر مبنی ہے بلکہ اقبال کا نظریہ عورت کے لئے احترام سے لبریز نظر آتا ہے،

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ — اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی — کہ ہر شرف ہے اسی درج کا در مکنوں

مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن — اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطوں

آخری شعر اس اعتبار سے محل نظر ہے کہ تاریخ عالم میں صنف نازک کا علمی مقام اس کی تائید نہیں کرتا[1] لیکن اس کے ساتھ ہی پہلا شعر "شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی" عورت کے لئے عزت و احترام کا جو جذبہ اور عورت سے صحت مند معاشرے کی تشکیل د

[1] معارف: اگر اس شعر سے یہ مطلب لیا جائے کہ کوئی عورت افلاطون نہیں بن سکی، مگر افلاطون پیدا کر سکی تو یہ شعر محل نظر نہیں رہ جاتا،

تکمیل کی جو توقع لئے ہوئے ہے اس کے پیش نظر یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ ایک پختہ کردار سماج کے لئے اقبال عورت کی پختگی کردار کے کس قدر قائل ہیں:

جہاں را محکمی از امہات است — نہاد شان امین ممکنات است
اگر این نکتہ را قومے نداند — نظام کاروبارش بے ثبات است

ز شام ما برون آور سحر را — بہ قرآں باز خواں اہل نظر را
تو می دانی کہ سوز قرات تو — دگرگوں کرد تقدیر عمر را.

(۲)

مثنوی رموز بے خودی کا ایک طویل اقتباس جس میں اقبال نے امومت کی عظمت سے بحث کی ہے، اس سے قبل نقل ہو چکا ہے۔ اس اقتباس کو ہم اس عظیم عورت کے کردار سے ہٹ کر نہیں دیکھ سکتے، جس کے آغوش میں اقبال نے پرورش پائی، اور جس کے انتقال کے بعد اقبال نے اسے اس طرح یاد کیا:

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار — کون میرا خط نہ آنے سے رہیگا بے قرار
خاک مرقد پر تری لیکر یہ فریاد آؤنگا — اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤنگا
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا — گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات — تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

اور غالباً مندرجۂ ذیل رباعی کہتے وقت بھی اقبال کے پیش نظر ان کی والدہ محترمہ ہی رہی ہوں:

مرا داد این خرد پرور جنونے — نگاہ مادر پاک اندرونے

ز مکتب چشم و دل نتواں گرفتن — کہ مکتب نیست جز سحر و فسونے

دراصل اقبال کی تربیت اور ان کی شخصیت کی تشکیل میں ان کی والدہ محترمہ کا بڑا ہاتھ تھا[1]، اقبال کو اس امر کا ہمیشہ احساس رہا کہ ماں کی آغوش ہی بچے کی پہلی تربیت گاہ ہے، اس سانچے میں بننے والے بن گئے، اور بگڑنے والے بگڑ گئے، چنانچہ "خطاب بہ جاوید" میں اپنے فرزند سے کہتے ہیں:

مادرت درس نخستیں با تو داد — غنچۂ تو از نسیم او کشاد
از نسیم او ترا این رنگ و بوست — اے متاع ما بہائے تو از دست
دولت جاوید از و اندوختی — از لب او لا الٰہ آموختی

اقبال کے یہاں امومت کی عظمت پر بات چیت کرتے وقت شوپن ہار کی جانب خیالات منتقل ہو جائیں، تو کچھ تعجب نہیں، کیونکہ عورت کے بارے میں شوپن ہائر کے نظریات

---

[1] اقبال کی والدہ محترمہ کے انتقال پر اکبر الٰہ آبادی نے یہ اشعار کہے:

حضرت اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں — قوم کی نظریں جو ان طرز کی شیدا ہوئیں
یہ حق آگاہی یہ خوش گوئی یہ ذوق معرفت — یہ طریق دوستی خودداری با تمکنت
اس کے شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے — باخدا تھے اہل دل تھے صاحب اسرار تھے
جلوہ گر ان میں انہی کا ہے یہ فیض تربیت — ہے ثمر اس باغ کا یہ طبع عالی منزلت
مادر مرحومۂ اقبال جنت کو گئیں، — چشم تر ہے آنسوؤں سے قلب ہے اندوہگیں
رو کا مشکل ہے آہ و زاری و فریاد کو — نعمت عظمیٰ ہے ماں کی زندگی اولاد کو
اکبر اس غم میں شریک حضرت اقبال ہے — سال رحلت کا یہاں منظور آنی الحال ہے
واقعی مخدومۂ ملت تھیں وہ نیکو صفات — رحلت مخدومہ سے پیدا ہے تاریخ وفات

۱۳۳۳ھ

بھی اسی تربیت پر مبنی ہیں، جو اُسے ماں کی آغوش میں ملی، فرق صرف اتنا ہے کہ شوپن ہاور کی تربیت نفرت کے ماحول میں ہوئی، اور اس کا دل عورت کے خلاف زہریلے جذبات سے لبریز ہوگیا، جس کا اظہار اس نے وقتاً فوقتاً اپنی تحریروں میں کیا ہے،[1] ان خیالات کی ایک جھلک دیکھئے:۔

"صرف وہی شخص ہی جس کی عقل پر نفس پرستی کا پردہ پڑا ہے اس ٹھگنے قد، تنگ کندھوں اور چھوٹی چھوٹی ٹانگوں والی مخلوق کو صنفِ نازک کہے گا، کیونکہ جنس کے سارے حسن کا دارومدار دراصل اسی ہیجان اور ترنگ پر ہے، عورت کو خوبصورت کہنے کی بہ نسبت اسے بدصورت کہنا زیادہ موزوں ہوگا، عورتوں میں موسیقی شاعری یا کسی بھی فنِ لطیف سے اثر پذیر ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ہے، اگر وہ اس بات کا اظہار کرتی ہیں کہ انھیں شعر و موسیقی یا فنِ لطیف سے کوئی رغبت ہے تو یہ محض دھوکے اور فریب کے سوا، اور کچھ نہیں اور مقصد اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح سے مرد کو خوش کرسکیں،

"عورتیں کسی بھی معاملے میں خالص معروضی دلچسپی لینے کے قابل نہیں، اس صنف میں اعلیٰ ترین ذہن بھی فنِ لطیف میں کوئی ایسا کارنامہ پیش نہیں کرسکا جو واقعی خالص اور طبع زاد ہو، صرف فنِ لطیف ہی نہیں، یہ صنف کسی میدان میں بھی مستقل نوعیت کا کوئی کام نہیں کرسکی،

اور یہ کتنی لغو بات ہے کہ جائداد کے حقوق عورتوں کو دیدیئے جائیں، تمام

---

[1] مفصل بحث کے لئے مصنف کی کتاب اقبال اور مغربی مفکرین" میں مقالہ بعنوان اقبال اور شوپن ہاور" ملاحظہ کیجئے،

عورتیں چند متشیات کو چھوڑ کر فضول خرچی کی جانب مائل ہوتی ہیں، وہ حال میں زندگی بسر کرتی ہیں اور اُن کی گھر سے باہر کی سرگرمی محض بازار میں خریداری کرنا ہے اُن کا تقسیم فرائض کا نظریہ یہی ہو اسلئے میری رائے یہ ہے کہ عورتوں کو اپنے معاملات کا انتظام ہاتھ میں لینے کی اجازت بھی کبھی نہیں دینا چاہئے بلکہ جیسا کہ ہندوستان میں رواج ہے انھیں ہمیشہ کسی مرد کی نگرانی میں رہنا چاہئے خواہ وہ باپ ہو، شوہر ہو یا بیٹا ہو اور اگر یہ نہیں تو اُن پر حکومت کی نگرانی ہونا چاہئے"

شوپن ہاور جو چاہے کہے لیکن ہندوستان کی طرزِ معاشرت کو سمجھنے میں اس نے غلطی کی ہے، باپ شوہر یا بیٹے کی نگرانی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عورت کو ہندوستان میں کمتر یا ذلیل سمجھا جاتا ہے، بلکہ یہ ہندوستان کے معاشرے کا ایک صحت مند پہلو ہے، جسے اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے؛

اک زندہ حقیقت میرے سینے میں ہے مستور	کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی	نسوانیتِ زن کا نگہبان ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا	اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

اقبال نے اپنے اس نظریے کے پیشِ نظر عورت کی جو تصویر پیش کی ہے اس کا ایک رُخ اگر والدہ محترمہ کی یاد میں" ہے تو ایک رُخ "فاطمہ بنت عبداللہ" ہے جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی، اسی طرح "شرف النساء" بھی اسی تصویر ہی کا ایک پہلو ہے اور حضرت زہراؓ بھی جو ایک انتہائی تابناک پہلو ہے،

(۴)

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اقبال عورت کے لئے ایک مصلح اور ریفارمر ہی بن کر آئے تھے، اقبال کی زندگی تجربات کا مرقع تھی، ان تجربات میں مشاہدات بھی شامل تھے، اور تفکر بھی استغراق بھی اور مطالعہ بھی، اور عنفوانِ شباب کی رنگ رلیاں بھی، مثنوی "رموزِ بیخودی" کے آخر میں حضرت رحمۃ للعالمین" عرضِ حال کرتے ہوئے خود اقبال اعتراف کرتے ہیں کہ میں مدتوں عشقِ مجاز

اور اس کے متعلقات میں مبتلا رہا لیکن یہ آرزو میرے سینے میں برابر آباد رہی کہ میری موت حجاز میں ہو
فرماتے ہیں،

مدتے با لالہ رویاں ساختم — عشق با مرغولہ مویاں باختم
بادہ با ماہ سیمایاں زدم — بر چراغ عافیت داماں زدم
برق رقصید گرد حاصلم — رہزناں بردند کالائے دلم
ایں شراب از شیشۂ جانم نریخت — ایں زر سارا از داماں نریخت
ہست قان رحمت گیتی نواز — آرزو دارم کہ میرم در حجاز
فرخا شہرے کہ تو بودی در آں — اے خنک خاکے کہ آسودی در آں
کوکبم را دیدۂ بیدار بخش — مرقدے در سایۂ دیوار بخش

شہزادی بمبا دلیپ سنگھ اقبال کی بہت مداح تھیں، اور اقبال کو اپنے یہاں چائے پر مدعو کرتی رہتی تھیں، ایک دفعہ بمبا نے شالامار میں چائے کا انتظام کیا، اس کی آسٹریلین سہیلی کے علاوہ ایک اور یورپین خاتون بھی مدعو تھیں، ایک نے علامہ اقبال کی خدمت میں باغ کا ایک پھول پیش کیا اور دوسرے نے ایک خوبصورت بلی پال رکھی تھی جو اس کی گود میں بیٹھی تھی علامہ کی دو نظمیں پھول کا تحفہ عطا ہونے پر، اور کسی کی گود میں بلی کو دیکھ کر اس موقع کی یاد میں لکھی گئی تھیں[۵۱]
اپنی ایک قدرداں خاتون کا جن کے بارے میں انھوں نے حسن و عشق[۵۲]، کلی[۵۳]، اور وصال[۵۴] ایسی نظمیں کہیں ان کی آٹو گراف بک میں یہ شعر لکھ کر دیا،

---

۵۱ ذکر اقبال،
۵۲ جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں — نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں
۵۳ مرے خورشید کبھی تو بھی اٹھا اپنی نقاب — بہر نظارہ تڑپتی ہے نگاہ بیتاب
۵۴ قید میں آیا تو حاصل مجھ کو آزادی ہوئی — دل کے لٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی

عالم جوش جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ — کیا حکم ہے دیوانہ بنوں یا نہ بنوں

ہنروران ہند کے عنوان سے اقبال کا ایک مشہور قطعہ ہے جس کا آخری شعر ہے،

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس — آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اس شعر کا ذکر کرتے ہوئے حفیظ ہوشیار پوری اپنے ایک مقالہ "عمر عزیز کے بہترین لمحے" میں لکھتے ہیں :- ایک دفعہ عرشی صاحب اور پروفیسر تبسم صاحب کی معیت میں آپ کے پاس گیا، تو ان مضمون اور نظموں کا ذکر چھڑ گیا، جو آج کل اردو کے عام رسائل میں شائع ہوتی ہیں، علامہ مرحوم اس بات پر اظہار افسوس کر رہے تھے کہ مجھے ضرب کلیم کا یہ شعر یاد آ گیا،

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس — آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

میں نے یہ شعر پڑھا اور پھر مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کے ان اشعار کی طرف اشارہ کیا، جو آپ نے حکمت فرعونی کے عنوان کے تحت عصر حاضر کے متعلق لکھی ہیں،

دختران او بزلف خود اسیر — شوخ چشم و خود نما و خردہ گیر
ساختہ پرداختہ دل باختہ — ابروان مثل دو تیغ آختہ
ساعد سیمیں شاں عیش نظر — سینۂ ماہی بہ موج اندر نگر

اس کے بعد علامہ کی خدمت میں عرض کیا کہ ان فارسی اشعار میں آپ نے عورت کا ذکر جس والہانہ انداز میں کیا ہے اس کے پیش نظر یہ شعر آپ پر بھی صادق نہیں آتا؟

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس — آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ اس شعر میں عورت شاعر پر سوار ہے، لیکن مثنوی کے فارسی شعروں میں شاعر عورت پر سوار ہے، اور دونوں میں فرق ظاہر ہے،[۵۵]

---

۵۵ ملفوظات اقبال

(۵)

لیکن اس قسم کے ضمنی واقعات یا لطیفے اقبال اور عورت ایسے گہرے موضوع پر کسی قدر کا تعین کرنے میں اتنی رہنمائی نہیں کرتے، جتنے وہ اشعار جن میں انھوں نے اس موضوع پر ان تمام مشاہدات اور تجربات کے بعد اپنے نظریات بیان کئے ہیں، ان تمام تجربات کا نچوڑ اقتباسات کی صورت میں اس مقالے میں آچکا ہے، یہاں مولانا ابو الحسن علی ندوی کے الفاظ میں یہ بیان کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ اقبال اپنے کلام میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ بلند ارشادات بھی لائے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ

رحبب الی من دنیاکم الطیب	مجھے دنیا کی چیزوں میں خوشبو اور
والنساء وجعلت قرۃ عینی فی	اور عورتیں پسند کرائی گئی ہیں، اور میری
الصلوٰۃ۔	آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے،

اقبال نے اس حدیث کا بھی حوالہ دیا ہے کہ

"جنت ماؤں کے قدموں تلے ہے،"

انھوں نے امومت کو رحمت کہا ہے، اور اُسے نبوت سے تشبیہ دی ہے، ماں کی شفقت کو وہ پیغمبر کی شفقت کے قریب کہتے ہیں، اس لئے کہ اس سے بھی اقوام کی سیرت سازی ہوتی ہے، اور ایک ملت وجود میں آتی ہے،

اس تصریح کے بعد کلام اقبال میں عورت کے درجہ کی بحث ان اشعار کے بغیر نامکمل رہے گی جن میں اقبال مخدراتِ اسلام سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں

اے ردایت پردہ ناموس ما	تابِ تو سرمایۂ فانوس ما
طینت پاک تو مارا رحمت است	قوتِ دین و اساسِ ملت است
کودکِ ما چوں لب از شیر تو شست	لا الٰہ آموختی او را نخست
می تراشد مہر تو اطوارِ ما	فکر ما گفتارِ ما کردارِ ما
برقِ ما کو در سحابت آرمید	بر جبل رخشید و در صحرا تپید
اے امین نعمت آئینِ حق	در نفسہائے تو سوزِ دینِ حق
دورِ حاضر تر فروش و پُرفن است	کاروانش نقد دیں را رہزن است
کور و یزداں ناشناس ادراک او	ناکساں زنجیری پیچاک او
چشم او بیباک و ناپرواستے	پنجۂ مژگانِ او گیراستے
آب بند نخل جمعیت توئی	حافظِ سرمایۂ ملت توئی
فطرتِ تو جذبہ دارد بلند	چشم ہوش از اسوۂ زہرا مبند

تا حسینے شاخ تو بار آورد

موسم پیشیں بہ گلزار آورد

بہمنی۔ عثمانی سفارتی تعلقات

از

جناب غلام محمد نظام الدین مغربی لکچرر و صدر شعبہ تاریخ اردو آرٹس کالج حیدرآباد دکن

دکن کی بہمنی سلطنت (۱۳۴۷ء تا ۱۵۲۳ء) ہندوستان کی پہلی ریاست ہے جس نے دولت عثمانیہ ترکی کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کئے[1]، ان تعلقات کے آغاز میں اس ریاست کے لائق وزیر اعظم خواجہ جہاں محمود گاواں کا خاص حصہ تھا، محمود نے ۱۴۶۶ء میں اپنی وزارت عظمیٰ اور کم عمر سلطان محمد شاہ لشکری بہمنی (۱۴۶۱ء تا ۱۴۸۲ء) کے زمانہ میں[2] چند سال تک اندرونی مسائل حل کرنے کے بعد بیرون ہند کی ریاستوں اور عالم اسلام کے اہم درباروں کے ساتھ سفارتی اور سیاسی روابط قائم کرنے کی طرف توجہ دی تاکہ ایک طرف اس کی حیثیت بہمنی دربار میں مستحکم ہو، اور دوسری طرف ہندوستان کی دیگر ریاستوں میں بہمنی سلطنت کا وقار بلند ہو[3]۔

پندرھویں صدی کے نصف آخر میں بہمنی سلطنت اپنی وسعت۔ قوت اور دولت کے اعتبار سے عالم اسلام کی کئی ریاستوں پر سبقت لے جا چکی تھی، اور محمود نے اپنی خارجہ پالیسی کے ذریعے اس ہندوستانی ریاست کے بین الاقوامی وقار میں غیر معمولی اضافہ کیا، اور

[1] پروفیسر عزیز احمد۔ Studies in Islamic Culture in the Indian Environment آکسفورڈ ۱۹۶۴ء ص ۴۲ و پروفیسر رشید The Mughals and the Ottomans پاکستان سہ ماہی۔ کراچی ۱۹۵۵ء ص ۹

(بقیہ حاشیہ ص ۵۵ پر)

اور اسی خارجہ پالیسی کی ایک کڑی دولت عثمانیہ ترکی کے ساتھ سفارتی تعلقات تھا[4]۔

بہمنی۔ عثمانی سفارتی تعلقات کی ابتداء ۱۴۶۲ء میں ہوئی[5]۔ یہ تعلقات تین عہد ں

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴) [2] پروفیسر ہارون خان شیروانی History of Midieval Deccan حیدرآباد ۱۹۷۴ء جلد ۱ صفحہ ۱۹۰۔ [3] محمود گاواں نے اپنے اور اپنے بادشاہ کی طرف سے ہندوستان اور بیرون ہند کی ریاستوں کے امراء اور سلاطین کو جو خطوط روانہ کئے تھے، وہ اس کے مجموعہ منشآت "ریاض الانشاء" میں محفوظ ہیں۔ جس کو بعد تصحیح مجلس اشاعت مخطوطات فارسی، حیدرآباد نے ۱۹۴۸ء میں گورنمنٹ پریس حیدرآباد میں طبع کر کے شائع کیا ہے، ہارون خان شیروانی صاحب کا خیال ہے کہ "ریاض الانشاء" محمود گاواں اور اس کے بعد کے عہد میں ترکی میں قطعی غیر معروف تھی۔ (Bahmanes of Deccan۔ مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۵۳ء صفحہ ۳۲۲) لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب ترکی میں بے حد مقبول تھی، اور محمود کے انتقال کے پچاس سال کے اندر ایڈریانوپل اور استانبول میں اس کے کئی قلمی نسخے تیار ہو چکے تھے ان نسخوں کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: راقم کا مضمون ریاض الانشاء کے قلمی نسخے استانبول میں۔ ماہنامہ معارف اعظم گڈھ بابت اپریل ۱۹۷۰ء حاشیہ صفحہ ۲۹۱۔ [4] یہ بات ذہن نشین رہنا چاہیے کہ بہمنی اور ترکی سلاطین کے تعلقات بالکل مساویانہ درجہ پر قائم تھے۔ البتہ محمود گاواں وزیر کی حیثیت سے جب سلطان ترکی کو خط لکھتا تو وہ اپنے عہدے کے اعتبار سے سلطان کو مخاطب کرتے وقت ان کے اعزاز کا خاص خیال رکھتا تھا، پروفیسر شیروانی صاحب نے لکھا ہے کہ محمود نے سلطان ترکی کو "خلیفۂ اسلام" تسلیم کیا تھا۔ (دیکھئے Bahmanis of Deccan ص ۳۲۴) حیدرآباد کے ایک اور اسکالر ڈاکٹر نعیم نے بھی یہی بات دہرائی ہے (دیکھئے Foreign cultural Relations of Bahmanies) ہارون خان شیروانی تہنیتی جلد۔ شائع کردہ اسٹیٹ آرکائیوز حیدرآباد۔ ۱۹۶۵ء۔ ص ۳۹۰) مگر دونوں نے محمود کے

میں منقسم ہیں، عہد اول۔ محمد سوم بہمنی و محمد دوم عثمانی کے مابین تعلقات جب کہ محمود گاواں وزیر اعظم تھا۔ عہد ثانی۔ محمد سوم بہمنی اور بایزید دوم عثمانی کے تعلقات۔ اور عہد ثالث۔ محمود شاہ بہمنی

(بقیہ حاشیہ ص ۴۵) ان خطوط پر غور نہیں کیا جو سلطان ابوسعید گور گانی۔ سلطان علاء الدین گیلانی۔ اور سلطان اوزون حسن وغیرہ کے نام لکھے گئے تھے، جن میں ان تمام بادشاہوں کے لیے خلیفہ اور صاحبان خلافت کے القاب استعمال کئے گئے ہیں، یہاں تک کہ ریاض الانشاء کے مکتوب نمبر ۱۲ میں سلطان دکن نظام شاہ بہمنی کے لیے بھی "مرکز دائرہ خلافت و قطب فلک سلطنت" کے القاب استعمال کیے ہیں، جس سے ظاہر ہے کہ خلیفۂ اسلام کا جو تصور ہمارے ان مصنفین کے نزدیک ہے وہ محمود گاواں کے نزدیک ان القاب کے استعمال کے وقت نہ تھا، بلکہ وہ ہر بادشاہت کو خلافت سمجھتا تھا، سلطان ترکی کو خلیفہ کہنا محمود کے نزدیک کوئی خاص امتیازی بات نہ تھی اور اس وقت کے سلطان ترکی محمد فاتح کو خلافت کا دعویٰ بھی نہ تھا، [۳] ۱۴۶۲ء میں بیدر اور قسطنطنیہ کے درمیان سفارتی تعلقات کی ابتداء کا ثبوت اس طرح ملتا ہے کہ عثمانی وزیر اعظم محمود پاشا کی پہلی وزارت ۱۴۶۶ء میں ختم ہو گئی، جبکہ ابھی محمود گاواں کا موقف بہمنی سلطنت میں مضبوط نہ ہو سکا تھا، اور اس عرصہ میں بیرون ہند سفارتوں کی روانگی بعید از قیاس ہے، دوسری مرتبہ محمود پادشاہ ۱۴۷۲ء میں وزیر اعظم ہوا اور ۱۴۷۴ء میں معزول کر دیا گیا، اور محمود پاشا کی سفارت کا ۱۴۷۴ء کے بعد بیدر آنا خارج از بحث ہے، کیونکہ معزولی کے کچھ عرصہ بعد ہی وہ قید کر کے قتل کر دیا گیا۔ محمود پاشا کی معزولی سے قبل بیدر سے دو مکتوب اور قسطنطنیہ سے ایک مکتوب کی روانگی عمل میں آئی۔ اسی لیے اُس دور کے وسائل آمد و رفت اور سفراء کی مہمانداری کی روایات کے پیش نظر ان سفارتی مراسلات کے درمیان ایک سال کا وقت لازماً لگا ہوگا، ۱۴۶۲ء کا سال بہمنی۔ عثمانی سفارتی تعلقات کی ابتداء کا سال قرار پاتا ہے۔ محمود پاشا کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام از ایچ۔ آر۔ گب جلد ۳ مطبوعہ لندن ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۳۶

اور بایزید دوم عثمانی کے تعلقات۔ پہلا عہد بھی تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) ۱۴۶۲ء تا ۱۴۷۳ء۔ (۲) ۱۴۷۹ء تا ۱۴۸۱ء (۸۸۳ھ) تا ۱۴۸۱ء

عہد اول کا پہلا دور ۱۴۶۲ء۔ ۱۴۷۳ء

بیدر سے قسطنطنیہ سب سے پہلا سفارتی مراسلہ ۱۴۶۲ء میں محمود گاواں نے محمود دوم عثمانی (۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۱ء) کے نام روانہ کیا۔ اس خط میں عثمانی سلطان کی فتوحات پر اظہار مسرت سلطان کی ترقی کے لیے دعا اور ملاقات کی تمنا کا اظہار ہے۔[۱]

"تقبیل نامل بحر نایل ابر خصائل۔ بساعدت توفیق بی حجاب سراپردۂ تعویق بالکل طرق حاصل آید .... روشن و مبرہن است کہ سطح بسیط اقالیم ارض بالطول والعرض جہت بسط و ربط و حکم و ضبط آن پادشاہ جہان پناہ مرتب و موضوع است ...... ہزار سال بقاے تو باد افزون تر" ...... وغیرہ لیکن خط کے متن سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ بہمنی سفیر کی حیثیت میں کس شخص کو ترکی روانہ کیا گیا تھا۔

قسطنطنیہ سے بیدر پہلا سفارتی خط عثمانی وزیر اعظم محمود پاشاہ کی طرف سے آیا چونکہ خط کا متن دستیاب نہیں ہے اسی لیے صرف اسقدر گمان کیا جا سکتا ہے کہ یہ مکتوب بہمنی وزیر کے متذکرۂ بالا مکتوب کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ محمود گاواں کو عثمانی وزیر اعظم کے مکتوب کی وصولی پر جو غیر معمولی مسرت ہوئی، اس کا اظہار جوابی مکتوب میں حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے[۲]

---

[۱] ریاض الانشاء (مطبوعہ) ص ۳۴ و ریاض الانشاء (قلمی نسخہ، فاتح کتب خانہ استانبول نمبر ۴۰۱۲ صفحات ۲۱ ب تا ۲۳ ب۔ [۲] ریاض الانشاء (مطبوعہ) ص ۱۳۶ و ریاض الانشاء (قلمی) ص ۱۰۰ ب

مخفی نماند کہ چوں مکتوب مسرت مشحون بصنوف و فنون اظہار اتحاد موشح بود لا جرم چمن فو ...د از تقاطر غمام اقلام آن محی آثار کرام مرشح آمد و تخم محبت کہ در مزرعہ دل کشتہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل بود۔" ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محمود کو عثمانی سفرا کے ذریعہ سلطان ترکی اور ترک وزیر اعظم کے اختلافات کا علم ہو چکا تھا، اسی لیے عہدۂ وزارت کی مشکلات کا ذکر یوں کرتا ہے۔ "و اساس استحقاق وزارت و ریاست کہ دریں زمان سمت انہدام و اندراس پذیرفتہ بود۔ بدعائم و قوائم اصابت رائے و کمال سداد آن صدر دیوان ۔ ۔ ۔ ۔ زینت و استحکام یافتہ است"۔ بہمنی سفرا مقیم قسطنطنیہ کی خاطر خواہ عزت افزائی اور ان پر خصوصی توجہ کے لیے لکھتا ہے، "دربارۂ انفار و اسفار کہ در آن دیار اند نظر اکسیر اثر دریغ نمی دارند و سحاب اکرام و افضال بر چمن حال شان می بارند"[1] اس عبارت سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بہمنی سفرا اس وقت قسطنطنیہ میں مقیم تھے، اور محمود پاشا کا مکتوب خصوصی عثمانی سفرا کے ذریعہ بیدر پہنچا تھا۔ بہمنی سفرا کی خاطر خواہ عزت افزائی کے لئے عثمانی وزیر اعظم کی توجہ مبذول کرانے کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ اس کے ذریعہ عثمانی دربار میں اور ملکوں کے سفرا پر بہمنی۔ عثمانی گہرے برادرانہ روابط کا سکہ بٹھایا جائے اور ان ملکوں میں بھی اس کے ذریعہ بہمنی سلطنت کا وقار بلند ہو سکے،

چونکہ عثمانی وزیر اعظم کے نام پھر کوئی خط نہیں بھیجا گیا اور نہ آگے دونوں وزرا کے درمیان مراسلت ہوئی اسی لئے اندازہ ہوتا ہے کہ محمود گاواں کے اس جوابی مکتوب کی روانگی کے بعد ہی محمود پاشا کے قید و قتل کا واقعہ پیش آچکا تھا۔

[1] ریاض الانشاء (مطبوعہ) صفحہ ۱۲۸ ؛ ریاض الانشاء (قلمی) ص ۸۰ ب

دوسرا دور ۱۴۶۹ء تا ۱۴۸۱ء

محمد سوم بہمنی اور محمد دوم عثمانی کے عہد میں سفارتی مراسلات کا دوسرا دور ۱۴۶۹ء سے شروع ہوتا ہے، اس کا سبب یہ تھا کہ بہمنی دربار میں یہ اطلاع پہنچی کہ کسی سخت معرکہ میں عثمانی سلطان بال بال بچ گئے، اور اب سلطان سلامت اور محفوظ ہیں، اس اطلاع پر محمود نے سلطان بہمنی کی طرف سے مبارک باد کا مکتوب ایک خصوصی ایلچی فارس خان کی وساطت سے روانہ کیا۔ اس میں سلطان کی سلامتی پر مسرت کا اظہار اور بہمنی سفیر کی روانگی کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا تھا۔

"این صحیفۃ المؤدۃ فی اداء اسطاذی قعدہ از مرحلۂ ضمیر منزل تحریر نزول یافت مبنی بر آنکہ چوں اخبار سار مشتمل بر سلامتی آن ذات معدلت شعار و جریان سیلاب سیوف صاعقہ مواد ش بر سبل صدور و مہر ظلم کفار و اصرار و اصل شد۔ از استماع این خبر فرحت اثر منجوق رایت مسرت ر و ان بفرق عیوق آسمان رسید و ہر ملک از ملائکہ ملاء اعلی ندائے ادائے حمد و ثنا را بگوش ہوش شنید ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دریں وقت از وفور شوق و کمال کلف بر وفق مضمون نما تعارف منہا ائتلف زین الاکفار و الاقران معتمد فارس خان بسمت رسالت موسوم گشت تا ابواب استجاب با اہل رسل و مفتاح کتاب منفتح باشد۔"[1]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قسطنطنیہ میں بہمنی سفیر کا شاندار استقبال کیا گیا اور جب فارس خان نے واپسی کی اجازت چاہی تو سلطان محمد فاتح نے حسب ذیل فرمان بزبان ترکی جاری کر کے روانگی کی اجازت عطا کی۔[2]

[1] ریاض الانشاء (مطبوعہ) ص ۳۹۳ ۔ [2] قانون نامہ (قلمی)، بایزید دولت کتب خانہ استانبول۔ قسم ولی الدین نمبر ۱۹۶۹ صفحہ ۱۰۲

نشان میمون عالی شان	نشان میمون عالی شان وفرمان
وفرمان سامی مکان انفذہ	سامی مکان انفذہ اللہ تعالے الی
اللہ تعالی الی انقراض	انقراض الدوران حکم ہوا کہ توقیع
الدوران حکمی اولدر کہ	رفیع کے حامل جناب امارت مآب
دارندۂ توقیع رفیع جناب امارت	افتخار الامراء الکرام مختار الکبراء
مآب افتخار الامراء الکرام الکبراء	الفخام ذو القدر و الاحتشام
الفخام ذو القدر والاحتشام	المختص بعنایات اللہ الملک المنان
المختص بعنایات اللہ الملک	فارس خان دامت معالیہ
المنان فارس خان دامت	ہندوستان کے پادشاہ کی
معالیہ ہند پادشاہندن	طرف سے ہمارے دربار میں سفیر
رسالت طریقلہ عتبہ	کے طور پر آئے، اس طرح سفارت
علیامہ کلوب شولکہ	کی لازمی خدمات اس مقولہ
وظائف خدمات مبرورۂ	کے مطابق کہ قاصد کے ذمہ پہنچا
رسالت در مقتضای	دینا ہے، بہتر طریقہ پر انجام دیں،
وما علی الرسول الا البلاغ	واپسی کی اجازت دی جاتی ہے،
علی وجہ البلیغ قلوب	تاکہ بہتر طریقہ پر واپسی عمل
اجازت انصراف و	میں آئے۔
یربلیوب بو موجب العود	
احمد عودت ایدوب۔"	

مذکورۂ بالا فرمان میں کسی جوابی مکتوب کا ذکر موجود نہیں، اسی لیئے خیال ہوتا ہے کہ یہ مکتوب بعد میں عثمانی سفیر کے ذریعے روانہ کیا گیا۔ اور یہ عثمانی سفیر خواجہ جمال الدین حسن تھا جس کی دکن میں آمد اور سلطان ترکی کے مکتوب کی وصولی کا ذکر محمود گاواں نے بعد کے جوابی مکتوب میں کیا ہے۔ خواجہ جمال الدین حسن کے لائے ہوئے مکتوب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تاریخ تحریر اس کی آخری سطر میں درج ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ بیدر سے قسطنطنیہ کے لیے روانگی اور قسطنطنیہ سے بیدر میں عثمانی سفیر کی آمد کے درمیان نو ماہ کا وقفہ رہا۔

سلطان ترکی نے اپنے اس مکتوب میں بہمنی وزیر اعظم کو مخاطب کرتے ہوئے انتہائی تعظیمی القاب استعمال کئے" عالیجناب وزارت مآب امارت مآب صاحب اعظم دستور اکرم افخم خواجہ جہان ممہد [illegible]ان الجود والاحسان مشید بنیان الفضل والامتنان یمین الدولۃ البہمنیہ امین الملۃ المحمدیہ مرسل العلماء الاعلام صاحب الجوار المنشآت فی البحر کالاعلام۔۔۔۔۔ نظام الاسلام والملک والدولۃ والدین محمود اعلی شانہ"۔ بہمنی سفیر فارس خان کی آمد کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے "درین وقت اعز واکرم مجمع مکارم الادب ومحاسن الشیم فخر الفوارس والشجعات للہ در فارس ابن رکاب عالم پناہ آمد" آخر میں تاریخ تحریر یوں درج کی گئی ہے، تحریراً بالامر العالی الاعلی المتعالی فی اوائل رجب المرجب سنہ خمس وثمانین وثمانمایۃ"[1]

---

[1] خواجہ جمال الدین حسن کے لائے ہوئے اس مکتوب کو مشہور عثمانی رئیس الکتاب عبد اللہ آفندی نے "منشآت فارسی" میں صفحات ۲۲۸ الف تا ۲۲۹ ب پر نقل کیا ہے، جو انھوں نے ۱۰۳۹ھ مطابق ۱۶۲۹ء میں مرتب کی تھی، ڈاکٹر نعیم نے ہارون خان شیروانی تہنیتی جلد میں اس مکتوب کو منشات خواجہ جہاں میں

اس طرح یہ مکتوب محمود گاواں کے انتقال سے صرف سات ماہ قبل رجب ۸۸۵ھ مطابق اگست ۱۴۸۰ء میں روانہ کیا گیا تھا، اور بہمنی دربار میں وصولی پر سفارتی تعلقات عہد اولین کا دوسرا دور مکمل ہو جاتا ہے۔

تیسرا دور ۱۴۸۰ء تا ۱۴۸۱ء عہد اولین کی سفارتی سرگرمیوں کے تیسرے دور کا آغاز اس وقت ہوا جب بہمنی سفیر خواجہ عبد المنان کو قسطنطنیہ بھیجا گیا۔ اس کے ذریعے محمود گاواں نے سلطان ترکی کے مکتوب مورخہ رجب ۸۸۵ھ کا جواب روانہ کیا تھا۔ ریاض الانشاء کے صفحہ ۲۹۳، پر اس کی سرخی صرف اس قدر درج ہے۔

"مکاتب الی سلطان محمد شاہ الرومی" اس کے برخلاف عثمانی رئیس الکتاب احمد فریدون بے نے "منشآت السلاطین" جلد اول میں صفحہ ۲۵۸ پر حسب ذیل سرخی درج کی ہے۔

"ابو الفتح والمغازی جنت مکان سلطان محمد خان غازی حضرتلری درگاہ مہند خواجہ جہان انشا سیلہ ہند پادشاہی بہمن شاہ طرفندن تقدیم اولان نامہ نک صورتیدر"

(ابو الفتح والمغازی جنت مکان سلطان محمد خان حضرت غازی کے دربار کو بھیجے جانے والے بادشاہ ہند بہمن شاہ کے مکتوب کی نقل ہے، جس کا مسودہ خواجہ نے تیار کیا۔)

اس میں محمود گاواں نے سلطان ترکی کے مکتوب کی وصولی پر اپنی بے پایاں

(بقیہ حاشیہ ص ۵۱) منقولہ ظاہر کیا ہے، جو صحیح نہیں۔ ڈاکٹر نعیم کے بیان کے لیے دیکھئے "Foreign Cultural the Relations of the Bahmanies" H. K. Sherwani Felicitation Volume حیدرآباد ۱۹۷۵ء ص ۳۹۸، بحوالہ نشان ۳۶۷

مسرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔ "الحمد للّٰہ الذی انزل علی عبدہ الکتاب وجعلہ من عندھم لذلقی وحسن مآب بیت۔

آفتاب اندر بدخشان لعل سازد سنگ را
جذب جاموشی چہ گوید سنگ شکر آفتاب۔

مکتوب میں بیدر میں عثمانی سفیر کی آمد کا بیان اس طرح "جناب فخر الاماجد جامع المحاسن خواجہ جمال الدین حسن حفظہ اللہ تعالیٰ من حوادث الزمن.......شرف قدوم بشارت منعوم ارزانی داشت"[۱۲]

بہمنی سفیر عبد المنان کے قسطنطنیہ پہنچنے پر سلطان محمد فاتح نے اس خط کا جواب بھی بیدر روانہ کیا، جو غالباً محمود کے انتقال کے بعد پہنچ سکا۔ اگر محمود کو یہ خط مل جاتا تو ریاض الانشاء میں اس کا حوالہ اور لانے والے سفیر کا نام ضرور درج ہوتا۔

بہرحال سلطان ترکی نے اپنے اس دوسرے مکتوب میں حسب سابق محمود گاواں کو اعلیٰ القاب کے ساتھ مخاطب کرنے کے علاوہ بہمنی سفیر کی آمد کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

"واضح باشد کہ دریں وقت جناب رفعت مآب واعز واکرام امجد وافخم مجمع

(بقیہ حاشیہ ص ۵۲) منشآت فارسی از جمع صاری عبداللہ آفندی کا قلمی نسخہ سلیمانیہ کتب خانہ استانبول کے ذخیرہ اسعد آفندی میں نمبر ۳۳۳۳ محفوظ ہے، اس نسخہ میں ۱۰۰ اوراق اور سائز ۲۵ × ۲۰ سم ہے، اسعد آفندی کے ذخیرہ سے علامہ شبلی نعمانیؒ نے بھی اپنے قیام قسطنطنیہ کے دوران استفادہ کیا تھا، اس وقت وہ ایک آزاد کتب خانہ تھا، اب سلیمانیہ کتب خانہ میں ضم کر دیا گیا ہے، مضمون نگار کو ۱۹۷۶ء میں چھ ماہ اس کتب خانہ سے استفادہ کا موقع ملا۔

[۱۲] ریاض الانشاء ص ۲۹۴ جلد نمبر ۱ و منشآت السلاطین جلد ص ۲۵۸ تا ۲۵۹

مکارم الاداب ومحاسن الشیم افتخار الاعیان خواجہ عبد المنان اعطاہ اللہ ما یتمناہ تشریف داد وکتاب لطیف وخطاب شریف رسانید ومراسم تعظیم بتقدیم رسید۔"

مکتوب خاتمہ پر سلطان دکن کے لیے حسب ذیل الفاظ میں دعا درج ہے۔

خورشید تخت آں عالی ہمم قرین بخت برجیس حشمتم و بہرام و کیوان المکترین چاکران جناب انجم حشم باد با لنبی و آلہ الامجاد بیت

ہمیشہ تا کہ جہان در کمی و افزونست حسود جاہ تو کم باد وجاہت افزوں باد[1]

دربار دکن کے پاس سلطان محمد فاتح کا یہ آخری مکتوب تھا، افسوس کہ اس پر تاریخ درج نہیں ورنہ لانے والے سفیر کا پتہ چلتا ہے۔

عہد ثانی۔ محمد سوم بہمنی اور بایزید دوم عثمانی کے تعلقات

ربیع الاول ۸۸۶ھ مطابق مئی ۱۴۸۱ء میں فاتح قسطنطنیہ سلطان محمد دوم کا انتقال ہوگیا، اس سے صرف چند دن قبل بیدر میں محمود گاواں کے قتل کا واقعہ ۵ صفر ۸۸۶ھ کو پیش آچکا تھا، نئے سلطان بایزید عثمانی نے اپنے والد سلطان محمد کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد سلطان دکن کے دربار میں اپنا سفیر روانہ کرنا ضروری خیال کیا، چنانچہ ایک عالم مولانا سید محمد کو اپنے مکتوب کے ساتھ ہندوستان روانہ کیا۔[2] اس میں سلطان بایزید نے اپنے والد کے انتقال کی اطلاع دیتے ہوئے بہمنی سلطان سے یہ خواہش ظاہر کی کہ محمود گاواں کی کوشش سے دونوں مملکتوں کے درمیان جو دوستانہ تعلقات قائم ہوئے انھیں آئندہ بھی جاری رکھا جائے۔ مکتوب کے متن کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔[3]

---

[1] منشآت السلاطین جلد ۱ ص ۲۶۲ تا ۲۶۳ [2] احمد فریدون بے جلد ۱ ص ۲۹۹

[3] اس مکتوب کی سرخی فریدون بے نے غلط طور پر یوں درج کی ہے: "جنت مکان سلطان بایزید خان

والا جناب سلطنت مآب عزت نصاب سعادت اکتساب سیادت انتساب دولت در فعت قباب . . . . . . تحف تحیات وافرہ و ظرف تسلیمات متکاثرہ . . . .

(بقیہ حاشیہ ص ۵۴) غازی حضرت لوی ورکا ہندان ہند پادشاہی سلطان خلیل طرفنہ گوندریلان نامہ ہمایون صورتیدر" (جنت مکان سلطان بایزید خان حضرت غازی کے دربار سے ہندوستان کے بادشاہ سلطان خلیل کی طرف بھیجے جانے والے شاہی مکتوب کی نقل ہے) حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں ہندوستان میں سلطان خلیل کوئی بادشاہ ہی نہیں گزرا۔ البتہ اس وقت گجرات میں شہزادہ خلیل خان موجود تھا، جو ۱۵۱۳ء میں مظفر دوم کے لقب سے بادشاہ ہوا، لیکن اس بادشاہ کے خط میں محمود گاواں کا ذکر بے معنی ہے، خط کے متن میں قدیم روابط اور محمود گاواں کے قائم کردہ تعلقات کا خاص طور پر ذکر ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ یہ مکتوب سلطان دکن محمد شاہ لشکری کا موسومہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس مکتوب کی مزید کوئی نقل دستیاب نہیں لیکن اس کا جواب فریدون بے کی منشآت السلاطین کے علاوہ استانبول کے کتب خانوں کی منشآت کے دو اور مجموعوں میں موجود ہے، جن پر سلطان ہند کا خط ہونے کی سرخی درج ہے

فریدون بے نے اس ایک مکتوب کی سرخی ہی میں غلطی نہیں کی بلکہ مزید اور خطوط کی سرخیوں میں بھی غلطی کی ہے، مثلاً جلد ۲ صفحہ ۱۱ پر مغل شہنشاہ ہمایوں کے مکتوب موسومہ سلطان سلیمان کو پادشاہ ایران شاہ طہماسپ کا خط اور جلد ۱ صفحہ ۴۱۹ پر سلطان سلیمان کے مکتوب موسومہ سلطان گجرات احمد شاہ ثالث کو بحرین کے حاکم کا موسومہ ہونا ظاہر کیا ہے۔ منشآت السلاطین فریدون بے ایک ایسا مجموعہ ہے جس سے بڑے بڑے مستشرقین جیسے پروفیسر ایڈورڈ براؤن۔ پروفیسر ایچ۔ اے۔ آر۔ گبنس اور ہیمر پرگسٹال وغیرہ نے استفادہ کیا ہے۔ مصر۔ ترکی۔ ایران وسط ایشیا اور ہندوستان کی تاریخ کا اہم ماخذ ہونے کے باوجود یہ کتاب بے شمار غلطیوں کا مجموعہ ہے

مطالعہ نمایند و بدانند کہ چون جد اول مستقیمۂ اشخاص مختلفۂ عالم ناسوت و مناہل مستدیمۂ عرصۂ
ملکوت از تلاطم قلزم زخار غیب مطلق و تراکم قمقام جواہر نثار عالم عز جاری و منشق گشت و
بمقتضائے حکمت قادر بیچون و مرتضائے ارادت حاکم کن فیکون ۔ ۔ ۔ ۔ و در چمن خلد برین
ظل غبطہ طوبیٰ لمن ظل فی ظلہ بر چہرہ حال نشست مقدما بوسیلۂ اظہار ۔ ۔ ۔ ۔ خلوص
نیت جناب وزارت مآب ۔ ۔ ۔ ۔ خواجہ جہان محمود گاوانی ادام اللہ اعوام عمرہ
و وزارتہ اتحاد و یگانگی آن جناب ۔ ۔ ۔ جلوہ گری نمودہ ۔ ۔ ۔ ۔ روضہ مودت
خشک اگر نہ واسطۂ رشحہ قلم باشد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بدان صوب صولت مآب سفارت
قدوۃ السادات والاکابر ۔ ۔ ۔ ۔ سید محمد ۔ ۔ ۔ ۔ مبلغ گردانیدہ شد ۔ ۔ ۔ ۔
بعد از ادای رسالت حسن اجازت و انصراف دادہ ۔ ۔ ۔ ۔ با اخبار سلامتی ذات
شریف و عنصر لطیف روانہ گردانند"

محمد شاہ بہمنی نے سلطان بایزید دوم کے مکتوب کے جواب میں ایک تفصیلی مراسلہ روانہ
کیا، جس میں دونوں ملکوں کے قدیم تعلقات کے قیام میں محمود گاواں کی کوششوں کا اعتراف
کرتے ہوئے اس کے قتل کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے، اور آیندہ بھی سفارت اور

(بقیہ حاشیہ ص ۵۵) جس کی خاطر خواہ ایڈیٹنگ کی ضرورت ہے، بڑی حیرت
کی بات ہے کہ پروفیسر ایڈورڈ براؤن، اور پروفیسر ہارون شیروانی نے اپنی تالیفات
"تاریخ ادبیات ایران" اور "محمود گاواں" میں بہمنی سلاطین اور سلطان ترکی
کے ان مکاتیب کا تذکرہ کیا ہے، جو منشآت السلاطین کی جلد ۱ صفحات ۲۵۵
تا ۲۲۴ میں درج ہیں، لیکن اسی جلد ۱ کے صفحات ۲۹۹ تا ۳۰۱ پر محمد شاہ
بہمنی اور بایزید دوم عثمانی کی مراسلت کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

مراسلت کو جاری رکھنے کی خواہش ظاہر کی ہے،[1]

"واضح و ہویدا می گردد کہ صدر الاماثل جامع الفضائل و محاسن الخصائل
سید محمد کہ کوکب استحقاق رسالت از فلک شعار ۔ ۔ ۔ ۔ در ایمن ایام
و احسن مقام واصل گشت و عقد ود دل محبت آلود از صباح ورود مسعودش
وایصال کتاب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مثال غنچۂ دال و لام مذہرہ آمدہ و دو پرہائے
بہجت از غایت مسرت مانند دو چشم ہائے محبت منور گشت ۔ ۔ ۔
و درین وقت مولانائے اعظم مفخر العلماء مولانا نعمۃ اللہ کہ اخص مخصوصان
سید السادات بسمت رسالت متعین و موسوم گردانید ۔ ۔ ۔ ۔ و محقق
دانند کہ اگرچہ الی الآن بحسب الصورت خواجہ محمود گاوانی واسطۂ اتفاق
طرفین و مادۂ وفاق ذات البین می نمود و درین وقت بسبب آنکہ از صاحب
خبران وثیق و معتمدان صاحب سر صدائے نقش مخفی چند کہ مبنی از فساد و معبر
از عدم خلوص وداد او بود بسمع آن صفا فزا رسید و از افعال و اعمال
صورتی چند مشاہدہ نمود مناسب رتبت او نبود و مستلزم خلاف و عنادی نمود
بناء برین بر مقتضائے الناس مجزیون باعمالہم بعالم جزا واصل شدہ، تا ما آن
مودت سیما ہمیشہ بذاتہ مباشر تحریک سلسلۂ وداد و اتحاد گشتہ و ہمین طریقہ
پیوستہ مسلوک خواہد داشت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آمین فی ذی القعدہ سنہ ۸۸۶ھ"

[1] منشآت السلاطین جلد ۱ ص ۳۰۰ و مجموعہ منشآت (قلمی نسخہ) سلیمانیہ کتب خانہ استانبول
قسم اسعد آفندی نمبر ۳۳۳۶ صفحہ ۱۵۷ و منشآت خواجہ جہان (ریاض الانشاء) (قلمی)
سلیمانیہ کتب خانہ استانبول قسم فاتح نمبر ۴۱۲۳ صفحہ ۳۲۱ (بقیہ حاشیہ ص ۵۸ پر)

اس مکتوب کو قسطنطنیہ لے جانے کے لئے مولانا نعمۃ اللہ کو منتخب کیا گیا تھا، اس سے پہلے وہ محمود گاواں کی وزارت کے دور میں بادشاہ گیلان کے دربار میں سفیر رہ چکے تھے جہاں محمود کو اپنے بہت سے خاندانی مسائل طے کرنے تھے[۱۰]۔

ان کو بھیجنے کا مقصد یہ بھی تھا کہ دربار عثمانی میں محمود گاواں کے قتل کے بارہ میں اس کے ایک معتمد کی زبان سے محمد شاہ بہمنی کے موقف کی وضاحت و حمایت ہو۔ انکے اس تقرر سے محمد شاہ بہمنی کی غیر معمولی فراست و سیاست کا اندازہ ہوتا ہے۔

ذی قعدہ ۸۸۶ھ میں مولانا نعمۃ اللہ قسطنطنیہ روانہ ہوئے، اس کے صرف دو ماہ بعد یکم صفر ۸۸۷ھ کو محمد شاہ بہمنی کا انتقال ہو گیا۔

عہد ثالث:۔ محمود شاہ بہمنی و بایزید دوم کے تعلقات

بہمنی۔ عثمانی سفارتی سرگرمیوں کا تیسرا اور آخری دور تخت بیدر پر محمود شاہ بن محمد شاہ (۱۴۸۲ء تا ۱۵۱۸ء) کی مسند نشینی سے شروع ہوتا ہے۔ سلطان بایزید نے پہل کر کے محمود شاہ کی تخت نشینی پر شاہ برہان الدین خلیل اللہ کو مبارک باد کے مکتوب کے ساتھ دکن روانہ کیا۔[۱۱]

(بقیہ حاشیہ ص ۵۷) [۹] منشآت خواجہ جہاں وہ واحد نسخہ ہے جس میں اس خط کی تاریخ تحریر درج ہے اور یہ نسخہ رجب ۹۱۵ھ میں سلطان بایزید دوم کے دور میں ترکی میں نقل کیا گیا ہے، اسی لئے اس خط کی نقل مصدقہ ہے، مجموعہ منشآت۔ اور منشات السلاطین میں یہ خط "مسلوک خواہد داشت" کے الفاظ پر ختم ہو گیا ہے، تاریخ تحریر حذف ہو گئی ہے۔ [۱۰] ریاض الانشاء (مطبوعہ) صفحہ ۳۱۷، ۳۲۰، ۳۲۲، ۳۲۷، ۳۳۱،

[۱۱] عبداللہ آفندی، منشآت فارسی، صفحہ ۴۶ب تا ۴۸ب عبداللہ آفندی نے اس مکتوب کی سرخی غلط طور پر یوں درج کی ہے، "مکتوب بسلطان دکن از قبیل سلطان محمد خان علیہ الرحمۃ

اس مکتوب میں عثمانی سلطان نے انتہائی جذباتی انداز میں دونوں خانوادوں کی سابقہ دوستی کا ذکر کیا ہے،

"عالی جناب سلطنت مآب معدلت ایاب جلالت انتساب ..... مغیث السلطنۃ والعدالۃ والدولۃ والاقبال محمود شاہ وجوہ اضداد وملکہ ....

الحمد للہ کہ از قدیم الزمان الی ھذہ الآن میان این دودمان سلطنت آشیان و آن خاندان فلک آستان .....

رابطہ خلت و وداد و ضابطہ یگانگی و اتحاد بنوعی التیام پذیرفتہ ...... چنان اقتضا می نماید کہ سلاسل سوابق

(بقیہ حاشیہ ص ۵۸) والرضوان فرستادہ بود" عبداللہ آفندی نے اس مراسلت کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد منشآت فارسی مرتب کی ہے، اسی لیے انھیں اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ مکتوب کس کا تحریر کردہ ہے۔ ان کے اس مجموعۂ منشآت میں سلطان بایزید کی طرف سے دکن بھیجا جانے والا کوئی اور مکتوب موجود بھی نہیں۔ چونکہ قدیم فرامین اور شاہی خطوط پر مرسل کا نام درج نہیں ہوتا تھا، اسی لیے بھی عبداللہ آفندی کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں اسعد آفندی کے ذخیرہ کا یہ نسخہ غلطیوں سے معمور ہے، یہاں تک کہ کاتب نے املا کی بھی غلطیاں کی ہیں۔ اگر مکتوب کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو مکتوب کا سارا متن ثابت کرتا ہے کہ یہ محمود شاہ بہمنی کے نام اس کی تخت نشینی کی تہنیت میں تحریر کیا گیا ہے، مرسل اپنے اور مرسل الیہ کے آباء کی دوستی کا بھی حوالہ دے رہا ہے۔ محمود شاہ بہمنی کی تخت نشینی صفر ۸۸۷ھ میں ہوئی، اور اس سے گیارہ ماہ قبل ربیع الاول ۸۸۶ھ میں سلطان ترکی محمد خان کا انتقال ہو چکا تھا، اسی لیے سلطان محمد کا محمود شاہ کو مکتوب روانہ کرنا خارج از بحث ہے، یہ مکتوب دراصل بایزید دوم عثمانی ابن سلطان محمد خان کا مرسلہ ہے۔

مخالصت موروثی برحسب مودی الحب یتوارث بروابط مواخات
در سلک اخواناً علی سرر متقابلین مرتبت ساز ند ونہال
کثیر انما محبة الآباء قرابة الابناء وفرعها فی السماء انمادار
مثمر ثمار زاهر الازهار قرابة الابناء دارند"۔[۲۰]

بہمنی سلطان کو تخت نشینی پر مبارک باد حسب ذیل الفاظ میں دی گئی ہے۔

"بعد از ارتحال سلطان جنت مکان فردوس مصیر رضوان پدر بزرگوار ایشان
از این استناد آن عالی جناب بر مسند سلطنت و توسل بوسائد خلافت پایۂ قدر سریر
ملک ہمعنان اوج کیوان و کنگرۂ ایوان شریف موازی مشرف کاخ آسمان گشتہ
لاجرم بمقتضاے کذالک الابناء تبدل جہد ہم بتمام ماموا سس الآبار التزام مبادرت
بتقدیم مراسم تہنیت این موہیب عظمیٰ و عطیۂ کبریٰ لازم نمود۔ و جناب دولت مآب
سعادت ایاب عمدۃ الاکابر والعجم زبدۃ الاعالی بین الامم خواجہ برہان الدین خلیل اللہ[۲۱]
رفع اللہ شانہ برسم پرسش رسالت بدان صوب صواب نما فرستادہ بود تا مقصد
کتابی را بادار شفاے و خطابی مقترن ساختہ"۔

بیدر میں اُن دونوں کمسن بادشاہ محمود شاہ بہمنی کے لیے حالات قطعی ناسازگار تھے صوبوں

۲۰ عبداللہ آفندی صفحہ ۲۶ ب

۲۱ برہان الدین خلیل اللہ خان بادہی خلیل اللہ ہیں جو مولانا کمال الدین رومی کے صاحبزادے تھے انھیں انکے والد نے اپنے مکتوب کے ساتھ محمود گاواں کے پاس ایک بار دکن روانہ کیا تھا۔ (دیکھیے: ریاض الانشاء مطبوعہ، مکتوب نمبر ۲۹، صفحہ ۱۵۰) چونکہ مولانائے موصوف ایک بار بیدر کا سفر کر چکے تھے، اور بہمنی دربار سے اچھی طرح واقف تھے اسی لیے اس اہم سفارت پر مامور کیے گئے۔

کے گورنر اپنی آزادی کا اعلان کرنے میں مصروف تھے، اور خاص پایۂ تخت پر علاءالملک نظام الملک بحری اور قاسم
برید کا قبضہ تھا۔[۲۲] ان حالات کے باوجود دربار بیدر سے سلطان ترکی کے لیے قیمتی تحائف قسطنطنیہ روانہ
کیے گئے۔[۲۳] جب بہمنی سفراء حجاز و مصر سے گزر رہے تھے تو اس علاقہ کے مملوک سلطان قائتبائی نے ان
تحفوں میں بالجبر خیانت کرلی جس کے سبب مصر و ترکی کے درمیان ایک مختصر جنگ واقع ہو گئی۔ مصری
مورخ ابن ایاس نے اس کی تفصیلات ۸۹۰ھ مطابق ۱۴۹۲ء کے واقعات میں یوں درج کی ہے:

"سبب هذه الفتنة الواقعة بين السلطان ان بعض ملوك الهند[۲۴] ارسل الى ابن
عثمان هدية حافلة على يد بعض تجار الهند فلما وصل الى جدة احتاط عليها نائب
جدة واحضرها صحبته الى السلطان وكان من جملة تلك الهداية خنجر قبضته
مرصعة بفصوص مثمنة فطمع السلطان فى تلك الهدية واخذ الخنجر فلما بلغ
ابن عثمان ذالك حنق وجاء فى عقب ذالك أن على دولات تمراحی على ابن عثمان و
شكى له من افعال السلطان وما يصدر منه فتعصب لعلى دولات وأمده بالعساكر

۲۲ ہارون خان شیروانی The Bahmanis of Deccan حیدرآباد سنہ ۱۹۵۳ء صفحہ ۳۶۲

۲۳ ابن ایاس، بدائع الزہور فی وقائع الدہور مطبوعہ مصر ۱۸۹۴ء جلد ۲ صفحہ ۲۲۷؛ عزیز احمد ص ۴۸

۲۴ ابن ایاس نے یہاں بہمنی سلطان یا سلطان دکن نہیں لکھا لیکن ان دنوں ہندوستان کے کسی اور سلطان کے ساتھ عثمانی سلاطین کے تعلقات نہ تھے، پروفیسر عزیز احمد بھی اس بات سے متفق ہیں کہ تحفہ بھیجنے والا سلطان محمود شاہ بہمنی تھا۔ اس واقعہ کو عثمانی مورخ سعدالدین نے تاج التواریخ جلد ۲ صفحہ ۴۷ پر سبب اختلاف روم و عرب کی سرخی کے تحت یوں درج کیا: "ہندستان پادشاہی محمد شاہ بہمنی وزیر اعظمی اولان خواجہ جہان خواجہ محمود گاوانی آئین پیشینہ ری اوزرہ ہدایای جزیلہ ایلہ در دولتہ ایلچی گوندروب مصردن عبورلری ہنگامندہ اول ہدایای نفیسہ دن اکثریت خشونت و تشدید ین وبدعت

واستمرت الفتنة تتسع حتى كان منتهاما سنذكره في موضعه وقد طمع غالب ملوك الشرق في عسكر مصر بموجب ما وقع لهم مع سوار وبابندر وغير ذالك من ملوك الشرق ثم ان السلطان ارسل الخنجر المذكور والهداية التي بعث بها ملك الهند دارسل يعتذر الى ابن عثمان عن ذالك بعد أن صار ماصار[1]۔

ترجمہ:۔ عثمانی سلطان اور شاہ مصر کے درمیان اس فتنہ کا سبب یہ ہوا کہ بعض ہندوستانی بادشاہوں نے ہندوستانی تاجروں کے ذریعہ سلطان عثمانی کو تحائف بھیجے تھے، جدہ کے مصری نائب نے ان کو شاہ مصر کے پاس بھیجا، تحائف میں ایک خنجر بھی تھا، جس کا دستہ قیمتی جواہرات سے مزین تھا، شاہ مصر نے یہ خنجر لے لیا جب عثمانی فرماں روا کو یہ معلوم ہوا تو اسے بہت ناگوار ہوا اور جنگ وجدل کی نوبت پہونچی، جس سے مصر کے لیے بڑا خطرہ پیدا ہو گیا بالآخر شاہ مصر نے شاہ ہند کے مرسلہ تحائف اور خنجر عثمانی کو معذرت کے ساتھ بھیج دیا۔

(بقیہ حاشیہ ص (۶۱) وسیکہ اساسنی تجدید ایلہ غصب ایتمشدی" (ہندوستان کے بادشاہ محمد شاہ بہمنی کے وزیر اعظم خواجہ جہان خواجہ محمود گاوانی نے شاہی تعلقات کے اصول کے مطابق قیمتی تحفوں کے ساتھ در دولت پر ایلچی روانہ کیا، مصر عبور کرتے وقت ظلم و بدنیتی کی اپنی سابقہ روش کے احیاء کے ذریعے ان میں سے اکثر قیمتی تحفوں کو غصب کر لیا گیا۔) مورخ سعد الدین نے بھی غلطی کی ہے کہ تحفوں کو محمود گاواں سے منسوب کر دیا، سعد الدین ۹۴۳ھ/۱۵۳۶ء میں قسطنطنیہ میں پیدا ہوا اور ۱۵۶۶ء تا ۱۵۷۴ء کے عرصہ میں "تاج التواریخ" مرتب کی غالباً اس نے سلطان دکن کے تحفوں میں بادشاہ مصر کی خیانت کے واقعے کو کسی طرح سن کر گمان کر لیا کہ وہ محمود گاواں نے بھیجے ہوں گے، محمود شاہ اور محمود گاواں کے ناموں میں بہت مشابہت سے بھی اسے غلط فہمی ہوئی ہوگی، سعد الدین کے بیان سے ایک بات تو صریح ثابت ہوئی کہ وہ بہمنی سلطان کے تحفے تھے، جو سلطان ترکی کی خدمت میں بھیجے گئے تھے، مصر میں خیانت کا واقعہ ۸۹۰ھ/۱۴۵۸ء کا ہے اس لیے یہ بھی ثابت ہوا کہ ۸۹۰ھ کے بہمنی سلطان یعنی محمود شاہ بہمنی نے ان تحفوں کو روانہ کیا تھا،

[1] ابن ایاس جلد ۲ صفحہ ۲۲۷

ابن ایاس نے تحفوں میں خیانت کے اس واقعہ کو بیان کرنے کے آٹھ دس سطر بعد اسی ۸۹۰ھ کے واقعات میں حسب ذیل واقعہ بھی لکھا ہے، "وفيه عمل السلطان المولد النبي وكان حافلا ونصب في ذالك اليوم الخيمة العظيمة التي اقامها على يديه وجاءت في غايت الحسن والتزخرف وحضر في هذا المولد ملك التجار احمد بن محمود گاوان وكان جاء بصحبة الحجاج من مكة المشرفه فعظم امره بمصر جدا"[1] ابن ایاس نے جو یہ لکھا ہے کہ احمد بن محمود گاواں نے سلطان مصر سے میلاد النبیؐ کی تقریب میں ملاقات کی اور وہاں احمد کی بڑی عزت تھی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمود شاہ بہمنی نے اسی کے ذریعے یہ تحفے ترکی روانہ کئے تھے[2]،

چونکہ آگے کے دور میں سلطان بایزید اور محمود شاہ بہمنی کے درمیان کسی اور سفارتی مراسلت کا پتہ نہیں چلتا، اس لیے ثابت ہوتا ہے کہ سلطان ترکی کو محمود شاہ کی بے بسی اور دکن کے سیاسی تغیرات کا علم ہو چکا تھا، اسی لئے بہمنی عثمانی تعلقات کا باب ۸۹۰ھ میں ختم ہو گیا۔ البتہ آگے کے دور میں سلطنت گجرات کے ساتھ نیا سلسلہ شروع ہوا[3]۔

---

[1] ابن ایاس جلد ۲ صفحہ ۲۲۸۔ [2] شاید ابن ایاس کے اس بیان سے بھی مورخ سعد الدین کو غلط فہمی ہوئی کہ تحفے محمود گاوان نے بھیجے تھے،

[3] گجرات اور عثمانیوں کے تعلقات کے لئے ملاحظہ ہو:۔ نظام الدین مغربی۔ The ottoman- Gujrat Relations ہارون خان شیروانی بہمنی جلد ۲ صفحہ ۱۸۴

تلخیص و ترجمہ

اردو زبان کی عالمگیریت

از۔ محمد نعیم ندوی صدیقی ایم۔اے (علیگ)

دہلی کے انگریزی ہفتہ وار اخبار ریڈنیس کے ایک انگریزی مضمون سے یہ تلخیص پیش کی جارہی ہے، یہ مضمون ہندوستان کے ان تعلیمی اداروں کے اردو بولنے والے منیجروں اور سکریٹریوں کے لیے قابلِ مطالعہ ہے، جو اردو کو اپنے یہاں ذریعہ تعلیم بنانے میں گھبراتے ہیں۔ ن۔ص،

اردو پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، اور اس کا شمار آئینی طور پر ملک کی چودہ زبانوں میں کیا جاتا ہے، اس کو ترقی دینے میں ہندو مسلم سکھ عیسائی سب برابر کے شریک ہیں، یہ زبان ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کرتی ہے، اس زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں مغربی، جنوبی اور وسطی ایشیا کا بھی حصہ ہے، اسی زبان نے "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ دیا۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستانی زبانوں میں سے کسی نے بھی قومی یکجہتی کو فروغ دینے میں اتنی مدد نہیں کی جتنی اردو نے کی ہے۔

فارسی اور سنسکرت کے برعکس اردو ایک جدید زبان ہے۔ ترکی لغت میں لفظ اردو کے معنی "فوجی" کے ہیں۔ ہندوستان میں اردو زبان کے وجود کا پتہ اسی وقت سے چلتا ہے جب افغان، ترک اور مغل فوجی یہاں وارد ہوئے۔ آج بھی ہندوستانی فوجیوں کی اکثریت کے اظہار خیال کا ذریعہ اردو ہی ہے۔ کبھی یہ زبان بھاشا، ہندوی، ہندوستانی، ہندی زبان، دہلوی، کھڑی بولی، اردوئے معلی اور مدھیہ پردیش کی بولی کے نام سے یاد کی جاتی تھی،

۱۸۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ جس کا مقصد انگریزوں کو ہندوستانی زبان سکھانا تھا۔ کالج کے اسوقت کے پرنسپل ڈاکٹر جان گل کرائسٹ نے ہندوستان کے طول وعرض میں سفر کر کے علمی اور عام بول چال کی زبان کی براہ راست تحصیل کی۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کی ترقی کے پیش نظر ہندوستانی میں بہت سی کتابیں بھی لکھی ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی اردو سیکھنے کی ترغیب دلائی۔ ان کی اس سرپرستی، حوصلہ افزائی اور خود ان کی پرکشش شخصیت کے باعث بہت سے ہندو اور مسلمان اہل قلم کالج میں اکٹھا ہوگئے تھے۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو کے لیے "ہندوستانی" کا لفظ استعمال کیا۔ شاہ جہاں کے عہد میں یہ "اردوئے معلی" کہی جاتی تھی، آگے چل کر جب افغان اور ترک فوجی یہاں آئے تو اسکو ایک نیا نام اردو بمعنی فوجی یا لشکری دیا گیا۔ اسی زمانہ سے اس زبان کو "ریختہ" بھی کہا جاتا تھا،

انیسویں صدی کے وسط تک اردو زبان ہندی کے نام سے معروف تھی، اور دوسری ہندوستانی زبانوں کو بھاشا یا بھاکا کہا جاتا تھا۔ اس عہد میں فارسی رسم الخط کا اتنا زیادہ اثر تھا، کہ کھڑی بولی، برج بھاشا۔ اودھی اور بھوجپوری لٹریچر فارسی رسم الخط میں بھی لکھا جاتا تھا، لیکن دیوناگری میں نہیں۔ دیوناگری رسم الخط تو درحقیقت انیسویں صدی کے

وسط میں فارسی رسم الخط کے ردعمل کے طور پر وجود میں آیا۔ اور اسی وقت سے موجودہ سنسکرت آمیز ہندی کی لہر کا آغاز ہوا۔

جواہر لال نہرو، مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستان کے اتحاد و سالمیت کی خاطر ہندوستانی کو ملک کی قومی زبان بنائے جانے کی پرزور وکالت کی تھی، لیکن بوجوہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

اردو کھڑی بولی ہی کی ایک مکمل شکل ہے، جو کبھی دہلی اور آگرہ کے اطراف میں بولی جاتی تھی، اور مسلمان سپاہیوں کی آمد سے قبل وہ اس علاقہ کی عام بول چال کی زبان تھی، اور ان کی آمد کے ساتھ ہی اس زبان کو حیات نو حاصل ہو گئی۔ ان سپاہیوں کی مادری زبان فارسی تھی۔ اور کھڑی بولی کے ساتھ ان کی زبان کی آمیزش نے اردو یا ہندوستانی کو جنم دیا۔ اس نئی زبان کو دوآبہ گنگ و جمن کے تمام باشندوں نے اپنی بول چال میں استعمال کیا، اردو زبان پنجابی، اور برج بھاشا سے مماثلت رکھتی ہے۔ اسی لیے کچھ محققین اردو کا سرچشمہ مذکورہ بالا زبانوں کو قرار دیتے ہیں۔

کسی زمانہ میں ہندوستان کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ انیسویں صدی کے وسط میں اردو نے اس کی جگہ لے لی، اردو زبان کے دلنمٹ نقوش صوبہ دہلی اور اترپردیش کے چپے چپے پر ثبت ہیں۔ اگرچہ کچھ لوگ ان نشانات کو کھرچنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ آج بول چال کے عام الفاظ مثلاً انقلاب زندہ باد، آرام حرام ہے، آداب عرض، تشریف لائیے، ارشاد فرمائیے، آپ کی طبیعت کیسی ہے؟، مزاج شریف، جناب، صاحب، حضرت، حضور، یہ سب خالص اور عام استعمال کے اردو الفاظ ہیں۔

اردو کسی خاص فرقہ یا مذہب کی زبان نہیں۔ بلکہ یہ ایک عالمی زبان ہے، اس کو

بجا طور پر عالمی زبانوں میں اس حیثیت سے تیسرا مقام حاصل ہے کہ وہ بین الاقوامی طور پر بہت کثرت سے بولی جاتی ہے، چینی زبان بولنے والوں کی تعداد ۷۰ کروڑ ہے اور انگریزی بولنے والوں کی تعداد ۳۲ کروڑ ہے اس کے بعد اردو بولنے والوں کی تعداد ۲۳ کروڑ ہے، ایک انگریز کے قول کے مطابق اگر کوئی شخص ہندوستانی یا انگریزی زبان بول سکتا ہے تو وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں اپنا کام نکال سکتا ہے۔

آج کا المیہ یہ ہے کہ ہندوستانی زبان بولنے والے ہندوستانی باشندوں کو سرکاری طور پر ہندی بولنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے، معتبر اعداد و شمار کے مطابق سنہ ۴۶ء میں ہندوستانی (اردو) بولنے والوں کی تعداد ۱۶ کروڑ تھی۔ لیکن اب سنہ ۷۱ء کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق صرف تین کروڑ افراد کی مادری زبان اردو اور ۱۶ کروڑ ۲۵ لاکھ ۱۱ ہزار ۲ سو بارہ کی ہندی ہے۔ (جس میں سے ۹۰ لاکھ یوپی میں، پچاس لاکھ آندھرا پردیش میں۔ ۳۳ لاکھ بہار میں ۲۳ لاکھ مہاراشٹر میں اور ۳۰ لاکھ میسور میں ہیں)

یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ ہندوستان میں اگرچہ بعض وجوہ سے اردو کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ زبان پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے، مثلاً سوویت روس میں اردو کو بہت اہمیت حاصل ہے، تاشقند، سمرقند، بخارا، ماسکو اور لینن گراڈ کے بہت سے سکنڈری اسکولوں میں اردو پڑھائی جا رہی ہے، اسی طرح حکومت امریکہ نے اپنی بہت سی ریاستوں شکاگو، کیلیفورنیا اور پنسلونیا کے کچھ کالجوں میں اردو لازمی مضمون قرار دیا ہے نیویارک کی فورڈن یونیورسٹی کے ایک الحاقی کالج میں داخلہ حاصل کرنے والے طلبہ اردو کو بحیثیت ایک مضمون اختیار کرنے کے پابند ہیں۔ اسی طرح امریکہ کی شکاگو یونیورسٹی میں اردو کا ایک علیحدہ مستقل شعبہ قائم ہے۔ اور وہاں سے "نئی صدی" کے نام سے ایک

اردو رسالہ بھی شائع کیا جاتا ہے۔ غرض امریکہ کی ۳۳ یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم ہو رہی ہے، ماریشس (افریقہ) کے ۵۰ فیصد عوام کی مادری زبان اردو ہے گیانا، (جنوبی امریکہ) کے ۵۴ فی صد باشندوں کے اظہار خیال کا ذریعہ اردو ہے، اور وہ گیانا یونیورسٹی میں اس وقت پڑھائی بھی جارہی ہے، ہنگری حکومت نے اپنے ملک میں اردو کی تعلیم کے لیے بہت سی سہولتیں فراہم کر رکھی ہیں۔ مشرقی اور مغربی جرمنی کی ۱۲ یونیورسٹیوں میں اس وقت اردو پڑھائی جارہی ہے۔

جاپان یونیورسٹی نے بھی اپنے یہاں اردو پڑھانے کی آسانیاں بہم پہونچا رکھی ہیں بہت سے ایشیائی ممالک مثلاً تھائی لینڈ، برما، نیپال، سنگاپور، سری لنکا، ملائشیا بنگلہ دیش، پاکستان افغانستان اور ایران وغیرہ میں اردو سمجھی اور بولی جاتی ہے، سعودی عرب میں بھی اس نے اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔ چنانچہ وہاں بزم ادب نامی ایک تنظیم اردو کی خدمت کر رہی ہے، دوسرے عرب ممالک میں اردو کا سکہ گذشتہ چالیس سال سے چل رہا ہے، اور اردو میڈیم اسکولوں کی ایک کافی بڑی تعداد پائی جاتی ہے، اس کے علاوہ جنوبی افریقہ کے دور دراز کے شہروں مثلاً جوہنسبرگ ڈربن، کیپ ٹاؤن، کمپالا دار السلام وغیرہ میں بھی اردو نے عمل دخل حاصل کر لیا ہے، نیپال کے سکنڈری ایجوکیشن بورڈ نے اردو کو اپنے نصاب میں شامل کر لیا ہے۔ اور ۲۸ فیصد نیپالیوں کی مادری زبان اردو ہے مزید براں امریکہ، برطانیہ روس، چین، جاپان، اٹلی، ترکی، مصر، عراق، انڈونیشیا، سیلون، برما، افغانستان عدن ایران اور دوسرے کئی ملکوں کے ریڈیو اسٹیشن اردو پروگرام نشر کرتے ہیں، بہت سے ترقی یافتہ ممالک مثلاً اسکاٹ لینڈ، برطانیہ اور امریکہ سے اردو زبان میں رسائل بھی شائع ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا اجمالی جائزہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ اردو زبان اپنی شیرینی و لطافت شستگی و سلاست زمانہ کے ترقی پذیر رجحانات اور سائنس و صنعت و حرفت سے متعلق تمام خیالات و نظریات کو اپنانے کی صلاحیت کے باعث دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں اپنی ہر دلعزیزی کا علم بلند کئے ہوئے ہے، اور اس وقت دنیا کی سو سے بھی زیادہ یونیورسٹیوں اور نجی اداروں میں اردو کی تعلیم ہو رہی ہے۔

معارف کے گذشتہ سالوں کے مکمل فائل اور متفرق پرچے

معارف علوم و معارف کا گنجینہ، مشرقی و مغربی علوم و فنون کا دائرۃ المعارف اور ہزاروں علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، فقہی، دینی مضامین اور تحقیقات کا ایک دلآویز مجموعہ ہے، اسکی اسی دلآویزی اور اہمیت کی بناء پر اس کا آوازہ شہرت ہندوستان کی چہار دیواری سے گذر کر یورپ، امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہنچ گیا ہے مشرقیات کے جن غیر مسلم فضلاء نے غلط فہمی کی بناء پر جب جب بھی اسلام پر اعتراضات کئے تو سید صاحب اور ان کی نگرانی میں دار المصنفین کے نقاد محققین نے انکے دندان شکن جوابات اسی کے صفحات پر دئے ہیں، متفرق پرچوں کے علاوہ حسب ذیل رسالوں کے فائل تو بالکل مکمل موجود ہیں:۔ ۱۹۳۰، ۱۹۳۵، ۱۹۳۷، ۱۹۳۸، ۱۹۳۹، ۱۹۴۱، ۱۹۵۱، ۱۹۵۳، ۱۹۵۴، ۱۹۵۵، ۱۹۶۳، ۱۹۶۹، ان کو خرید کر اپنے کتب خانہ کی رونق بڑھائیں۔

"منیجر"

باب التقریظ والانتقاد

آج کا پاکستان

از

جناب ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دارالمصنفین

مذکورۂ بالا کتاب میں جناب احمد سعید ملیح آبادی اڈیٹر آزاد ہند کلکتہ نے اپنی صحافت نگاری کے آرٹ قلم کی شگفتگی، مشاہدہ کی قوت، الجھے ہوئے واقعات کو سلجھا کر کسی نتیجہ پر پہنچنے کی غیر معمولی قدرت کا پورا جوہر دکھایا ہے، وہ ۱۹۷۴ء میں پاکستان کی اسلامی کانفرنس میں ہندوستانی پریس کے ایک نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے، وہاں کے بیس روز کے قیام میں اسلامی کانفرنس کے جلسوں اور دعوتوں میں شریک ہوئے، پھر پاکستان کے مختلف الخیال رہنماؤں اور ہر طبقہ اور مکتب فکر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ملاقاتیں کیں، واپسی پر اپنے اخبار میں وہاں کے مشاہدات اور تاثرات کو قسط وار شائع کرنا .... شروع کیا، جو بہت دلچسپی سے پڑھا گیا، اب مزید اضافہ کے ساتھ انھوں نے ان مضامین کو کتاب کی صورت میں شائع کر دیا ہے، اس کے تین حصے ہیں، پہلے حصہ میں اس برصغیر کے بہت سے متنازعہ فیہ مسائل پر مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، دوسرے حصے میں انھوں نے پاکستان کے مختلف شہروں میں جو کچھ دیکھا اور پایا، اس کو اپنے تاثرات کے ساتھ قلمبند کیا ہے، تیسرے حصے میں پاکستان کے بعض وزیروں اور رہنماؤں

کے انٹرویو ہیں، اس کتاب کو ترتیب دیتے وقت مصنف نے پاکستان کے ایک سابق وزیر اعظم چودھری محمد علی کی دی ایمرجنس آف پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کی تقریریں، پاکستان کے موجودہ وزیر اعظم کی تصنیف دی گریٹ ٹریجڈی جنرل عتیق الرحمن کی کتاب لیڈر شپ سینیر کمانڈر اور پاکستان کی دوسری سرکاری دستاویزات مثلاً نیشنل پلاننگ کمیشن، سنٹرل بورڈ آف ریونیو، پاکستان اکانومک سروے وغیرہ سے استفادہ کرکے اور ان کے جا بجا اقتباسات دے کر اس کو باوزن بنا دیا ہے،

مصنف کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ پاکستان میں ہر لمحہ ہندوستان کے ایک باوقار اور وفادار شہری بنے رہے، اپنے ملک کی عزت و ناموس کو برقرار رکھنے کے لئے اس سے متعلق جو غلط فہمیاں تھیں، وہ دور کیں، (ص ۳۱) پاکستان کے وزیروں سے الجھے (ص ۳۱، ۲۱۰، ۲۳) خان عبد الغفار خاں سے ملے تو جنگ آزادی کے اس سپاہی کی ہندوستان دوستی کو یاد کر کے ان کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں، اُن کے ہاتھوں کو اپنے دل کے قریب سینے سے لگایا اور چوما (ص ۲۵۶) وہ اپنے والد بزرگوار مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی ہی کی طرح کٹر نیشنلسٹ اور قومی اتحاد کے علم بردار ہیں سوشلزم سیکولرزم اور جمہوریت ان کا نصب العین ہے، مگر ۲۰۰ صفحے کی اس کتاب میں کہیں پاکستان سے اپنی نفرت اور بیزاری کا اظہار نہیں کیا ہے، وہاں کی بری تصویر کھینچ کر نہ خود خوش ہوئے ہیں، اور نہ ملک کے انتہا پسندوں کو خوش کرنے کی کوشش کی ہے، بلکہ شروع سے آخر تک معروضی مطالعہ کا ایک اچھا نمونہ پیش کیا ہے، وہ پاکستانیوں ہی کی طرح لاہور کی اسلامی کانفرنس کے شاندار اجتماع کی کامیابی پر خوش نظر آتے ہیں، اس کی بہتر سے بہتر مرقع آرائی دل کھول کر کی ہے، پاکستانیوں کا گھمنڈ اور ان کے خیال کے مطابق یہ ہے کہ مہمان اور دوست کو وہ اس طرح سر پر بٹھائیں گے کہ لکھنؤ کو لوگ بھول جائیں، اور وہ بگڑ گئے تو پھر سر بازار پگڑی اتار لیں گے، اکثر پاکستانی لیڈروں سے ہمیں جا و بیجا سننا پڑتی ہے، اس کا پس منظر یہی ہے (ص ۲۱۲)

یہ ضروری نہیں کہ لائق مصنف نے اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اس کے ناظرین خصوصاً پاکستانی قارئین اتفاق کریں، کیونکہ ان کے اپنے خاص سیاسی خیالات ہیں جن کے ماتحت انھوں نے اس برصغیر کے سیاسی واقعات پر نظر ڈالی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کو اس آزادی ضمیر کا پورا حق حاصل ہے، قارئین کو بھی ان کی رائے سے اختلاف کرنے کا حق ہے، مگر ان کی کسی بھی رائے سے اختلاف کرتے وقت یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ صحیح نہ ہو لیکن اس میں وزن اور منطقی دلائل ضرور ہیں، جن کا تردید کرنا آسان بھی نہیں، ہر قسم کے مختلف فیہ مسائل پر ان کا قلم خوب چلا ہے، جس میں اُن کی تحریر کی شگفتگی کو بڑا دخل ہے، اسی لئے وہ اپنے قلم کو مختلف سمتوں میں موڑ کر خاطر خواہ اثر پیدا کر لیتے ہیں،

اس برصغیر کے متنازعہ فیہ مسائل پر کسی مسلمان کا کھل کر لکھنا آگ اور شعلے سے کھیلنا ہے، مگر مصنف نے اس آگ میں کود کر اپنی کتاب میں ایک گلزار تیار کرنے اور لہو کے پھول کھلانے کی کوشش کی ہے، وہ پاکستان اس وقت گئے، جب دو سال پہلے مشرق و مغرب دونوں محاذوں پر اس کو جو فوجی شکست ہوئی، تو بقول اُن کے میدانِ جنگ میں شکست کھا کر اور زخموں سے چور نڈھال اور نزار اور اکیلا، بیمار، اور بیزار اپنے آدھے لہولہان جسم کو سنبھالے ہوئے اپنی سانسیں گن رہا تھا، (ص ۳۷) مگر وہاں سے آنے کے بعد لکھا کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں شکست کھانے، اور ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو جانے کے باوجود پاکستان ایک عسکری طاقت کی حیثیت سے آج بھی موجود ہے، ۱۹۷۱ء کی جنگ میں پاکستان کا جو کچھ فوجی اعتبار سے نقصان ہوا تھا، اس کی نہ صرف تلافی کی جا چکی ہے، بلکہ فوجی اعتبار سے آج کا پاکستان تین سال پہلے کے مقابلے میں زیادہ طاقتور اور توانا ہے، اس لئے پاکستان کو نہ تو نظر انداز کیا جا سکتا ہے، اور نہ اسے دشمن بنا کر رکھنا ہندوستان کے قومی مفاد میں ہے، (ص ۱۴)

مصنف نے پاکستان میں بڑھتی ہوئی گرانی چور بازاری اور ضروری اشیاء کی قیمت میں بے تحاشا اضافہ اور وہاں کے لوگوں کی روزمرہ زندگی کی پریشانیوں کی پوری تفصیل لکھی ہے، (ص ۱۶۰) مگر وہاں کی صنعت کاری، کوئلہ، گیس، تیل، لوہا، سوتی کپڑے، چینی، سیمنٹ، اور غذائی پیداوار وغیرہ کا ناقدانہ اور غیر جانبدارانہ جائزہ لے کر وہ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ وہاں سب کچھ ہے جو ایک ملک کی ترقی اور استحکام کے لئے قدرت اسے عطا کر سکتی ہے"

(ص ۱۶۲)

مصنف کو پاکستان میں جو خامیاں نظر آئی ہیں، اُن کی طرف توجہ بڑی بے باکی سے دلائی ہے، مثلاً حزبِ اختلاف کے خلاف پاکستان کی پولیس کا رویہ (ص ۱۰۹) وہاں کے عدالتی نظام کی خرابی (ص ۱۱۳) وہاں کے پریس کی آزادی کی محرومی (ص ۱۱۰) مہاجروں کے ساتھ امتیازی سلوک (ص ۱۲۴) پر ان کا قلم بہت رواں ہوا ہے، مگر وہاں کی خوبیاں بیان کرنے میں بھی بخل سے کام نہیں لیا ہے، پاکستان کی مالی تجارتی اور صنعتی ترقی، کا ذکر فراخدلی سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں، پاکستان کی معیشت از سرِ نو اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی ہے، پیداوار نہ صرف بحال ہو گئی ہے بلکہ اس میں امید افزا اضافہ ہو رہا ہے، قومی دولت کی پیداوار میں چھ فی صدی اضافہ ہوا ہے،

زرِ مبادلہ کی پوزیشن تو کافی اچھی ہو گئی ہے، برآمدات میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے، جنگ کے دو سال بعد پاکستان کو دیکھنے سے یہ احساس نہیں ہوتا، کہ معاشی طور پر تباہ حال ملک ہے، دو سال کے قلیل عرصہ میں وزیر اعظم مسٹر بھٹو نے اپنے ملک کی معیشت کو دلدل سے نکال لیا ہے، آج پاکستان شاہراہ ترقی پر گامزن ہے، پورے ملک میں ایک جوش کی سی حالت ہے، کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے جو نقصان پہنچا ہے، اُسے کم سے کم وقت

ہیں پورا کر لینا ہے۔ جہاں تک برآمدات کا تعلق ہے تو متحدہ پاکستان کی مجموعی برآمدات سے بھی زیادہ
آدھے بچے ہوئے پاکستان کی برآمدات ہو رہی ہیں، ۱۹۷۰ء میں متحدہ پاکستان کی مجموعی برآمدات
۹۵۵۷۵ ملین ڈالر تھیں، ۱۹۷۳-۷۴ء کے لئے نشانہ ۱۱۰۰ ملین ڈالر رکھا گیا ہے، (ص ۱۴۲)
ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ پاکستان کے اردو صحافیوں کا معیار زندگی بلند کرنے کے لئے حکومت
. . . . کافی سرگرم نظر آتی ہے، پاکستان کے اردو صحافیوں
کو ہندوستان کے بڑے انگریزی اخباروں کے جرنلسٹوں کے برابر یا اس سے بھی سوا تنخواہیں اور
سہولتیں دی جاتی ہیں، پاکستان کا اردو پریس اپنی اشاعت اور سرمایے کی وسعت میں انگریزی
پریس سے بہت آگے نکل گیا ہے، (ص ۱۱۲)

حزب مخالف کے ساتھ حکومت پاکستان کا جو سلوک ہے اس پر بھی ان کی نظر گئی ہے مگر
وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ پشاور سے درۂ خیبر اور افغانستان کی سرحد تک میں نے سفر کیا کسی جگہ بھی آزاد
پختونستان کے آثار نظر نہیں آئے، نہ کوئی شورش، نہ ہنگامہ، نہ آزاد قبائل کی جنگ، داخلی سیاسی
بے چینی اور بات ہے، جو اپنے جمہوری حقوق کی پامالی کے خلاف پٹھانوں میں پائی جاتی ہے، مگر
علاحدگی پسندی اور پاکستان سے پختونستان کو کاٹ لینے کی کوئی علامت پورے سفر میں مجھے
دکھائی نہیں دی، (ص ۱۱۹)

پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو پر ہندوستان میں بیٹھ کر کسی مسلمان کا کچھ لکھنا تلوار
کی دھار پر چلنے سے کچھ کم نہیں مگر زیر نظر کتاب کے مصنف نے اُن کی پہلودار شخصیت کی ایک ایسی تصویر
کھینچ دی ہے، جو ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہوں کے ناظرین کی نظروں سے گزرے گی تو
دونوں جز بز تو ضرور ہوں گے، اگر وہ اس کی تردید کرنا چاہیں گے تو یہ کرتے بن بھی نہ پڑے گی'
مصنف کا خیال ہے کہ آج کے پاکستان کو سمجھنے کے لئے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو سمجھنا ضروری ہے'
(ص ۴۹)

مگر اُن کا سمجھنا آسان نہیں، مصنف نے بڑی جرأت سے اُن کی کمزوریاں اور خوبیاں دونوں
دکھائی ہیں، اور وہ خود اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وہ کوئی گھٹیا قسم کے گھاگ سیاست داں نہیں ہیں، نہ
۱۹۵۰ء کے بعد والی دہائی کے بعض پاکستانی وزرائے اعظم کی طرح مٹی کے مادھو ہیں، ..... اُن
کی کتنی پالیسیاں متضاد نظر آتی ہیں، مسٹر بھٹو اسے اپنا وصف قرار دیتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے
کہ پورا برصغیر تضاد سے بھرا ہے، اس لئے میرا متضاد نظر آنا باعث تعجب کیوں ہو، بات یہ ہے کہ
وقت اور حالات کے مطابق پلٹا کھا جانے کی سیاست کے ماہر ہیں، اور اس چیز کو وہ اصول سیاست
کی بنیاد سمجھتے ہیں، (ص ۴۸)

بعض سیاسی واقعات بہت ہی المناک اور ہولناک اور انتہائی مضرت رساں ہوتے ہیں'
مگر وہ تاریخ کے فیصلے ہوتے ہیں، جن کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں، پاکستان اور بنگلہ دیش
دونوں ہی تاریخ کے فیصلے ہیں، زیر نظر کتاب میں حسب ذیل سطریں کسی صحافی کے بجائے ایک
ایسے مورخ کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، جو اپنے جذبات اور خیالات سے عاری ہو کر اس برصغیر کے
اہم سیاسی واقعات کو تاریخ کا محض فیصلہ سمجھ کر تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہو گیا ہے،

"تقسیم کا ذمہ دار کسی فرد واحد کو قرار دینا صحیح نہیں ہو سکتا، اکیلا ایک آدمی ایک پوری قوم
کو چیر پھاڑ کر اُس کے ٹکڑے نہیں کر سکتا، جب تک ساتھ میں دوسرے بہت سے عوامل اور
ظاہر و مخفی عناصر مصروف کار نہ ہوں، جس طرح مسٹر محمد علی جناح کو تنہا تقسیم ہند کے لئے ذمہ دار
نہیں ٹھہرایا جا سکتا، اور اس کے لئے ماقبل تقسیم کے جملہ محرکات کو پیش نظر رکھنا ہوگا، اسی طرح
مسٹر بھٹو یا شیخ مجیب الرحمٰن کو انفرادی طور پر ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا، ہاں تقسیم کے عمل میں اُنکی ذمہ داریوں
کا احاطہ کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے اس لئے کہ اپنے اپنے دائرہ کار میں وہ تحریک کی قیادت کر رہے تھے (ص ۸۲)
لائق مصنف نے ایک بہت ہی اچھے ہندوستانی کی طرح دو قومی نظریے کی مخالفت

کی ہے (ص ۲۷) پاکستان کا ہندوستان پر حملہ کرنے میں پہل کی شکایت کی (ص ۲۱)، ہندوستان کے خلاف نفرت کی مہم کے بھی گلہ مند ہوئے ہیں، (ص ۱۷)، مگر اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ باہمی شکوک شبہات اور خدشات کے ذہن کو تبدیل کرنے کے لئے پاکستان کی لیڈرشپ اور دانشور طبقہ کو سخت محنت کرنی ہوگی، اور اتنی ہی محنت ہندوستان کو بھی پاکستان کا دل جیتنے کے لئے کرتے رہنا ہے، (ص ۲۲) لائق مصنف سچے دل سے اس کے قائل ہیں کہ برصغیر میں مستحکم اور پائدار امن کے لئے ہندوستان اور پاکستان میں دوستانہ تعلقات ضروری ہیں،... پاکستان سے دشمنی چلتی رہی تو بار بار تصادم کی نوبت آسکتی ہے، اور بڑی طاقتوں کو برصغیر میں دھما چوکڑی مچانے کا موقع ملتا رہے گا، اس علاقہ میں نہ پائدار امن ہوگا نہ سکون، دونوں ملکوں کی خوشحالی بھی متاثر ہوتی رہے گی، بجٹ کا کافی حصہ دفاعی اخراجات میں صرف ہوتا رہے گا، جس میں بچت کرکے دونوں ملکوں کے غریب عوام کو راحت پہنچائی جاسکتی ہے، پاکستان اور ہندوستان کی دوستی ہونا برصغیر کی سب سے بڑی ضرورت ہے، (ص ۱۴)

وہ اپنی کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں :-

"پاکستان سے بغض و کینہ، نفرت اور عداوت میرا موضوع نہیں، خیرسگالی دوستی اور بھائی چارہ میرا سندیسہ ہے، یہی میرے ملک کا بھی پیغام ہے، ہم پاکستان کے عوام کا برا نہیں چاہتے، وہ ہمارے بھائی ہیں، ہم ان کو اپنا دوست رکھنا چاہتے ہیں، اور اپنے لئے اسی جذبے کی توقع رکھتے ہیں، اسی نظر سے میں نے پاکستان کو دیکھا، اس کی خامیوں اور لغزشوں پر جہاں انگلی رکھی ہے، وہیں ان پہلوؤں کو بھی نظرانداز نہیں کیا جن میں پاکستان کی بھلائی اور خوبی کے آثار دکھائی پڑے، اگر یہ کتاب دونوں ملکوں کے درمیان امن و مفاہمت

اور اشتراک و تعاون کے ماحول کو بڑھانے، غلط فہمیوں اور اندیشوں کو گھٹانے اور تعلقات کو بہتر بنانے میں کچھ بھی کام آسکے تو یہی اس تمام جانفشانی کا صلہ ہوگا، جو پاکستان کے طویل اور تھکا دینے والے سفر میں مجھے اٹھانا پڑی تھی، مجھے یقین ہے کہ کتاب کے مطالعہ سے قارئین بھی یہی تاثر لیں گے، اور سرحد پار ہمارے پاکستانی بھائیوں اور دوستوں تک یہ پیغام محبت پہونچے گا تو امید ہے کہ پیار کے دو میٹھے بول وہ بھی بولیں گے"

اردو میں شاید پہلی دفعہ اس نیک جذبہ سے ایسی کتاب لکھی گئی، خدا کرے مصنف کا یہ بلند مقصد ہر طرح پورا ہو، پوری کتاب جس احتیاط، اعتدال اور امن پسندی کے نتیجے میں لکھی گئی ہے اس بنا پر مصنف کی توجہ اس طرف دلائی جائے، تو کچھ ہرج نہ ہوگا کہ اس میں کہیں کہیں خیالات کے اظہار یا بعض الفاظ کے انتخاب اور کچھ واقعات کو درج کرنے میں اور بھی احتیاط کی ضرورت تھی، مثلاً پولیس کے مظالم کی جو کہانی ص ۱۰۹ پر قلمبند کی گئی ہے، وہ نہ صرف مصنف کی تحریر کی سنجیدگی اور ثقاہت کے منافی ہے، بلکہ اس خیرسگالی کے لئے مناسب نہیں جس کے لئے مصنف نے اتنی مشقت اور ریاضت سے یہ کتاب لکھی ہے، اسی طرح شیطانی وسوسہ (ص ۲۸) چوپٹ، (ص ۱۱۳) ناعاقبت اندیش (ص ۳۷) کرتوت (ص ۳۷) درگت (ص ۳۸) کمر توڑ شکست (ص ۳۷) جھاڑو کے تنکوں کی طرح بکھر گئی (ص ۴۸) وغیرہ جیسے الفاظ اور جملے اس کتاب کے لئے موزوں نہیں، مگر ایسے الفاظ اور جملے زیادہ نہیں، کم ہیں،

کتاب کی کتابت اور طباعت بہت اچھی ہے، اس کی قیمت ۱۵ روپیہ ہے، دفتر آزاد ہند نمبر ۲۲ اے، ساگر دت لین، کلکتہ نمبر ۱۲ سے ملے گی،

مطبوعاتِ جدیدہ

طوطیانِ ہند — مرتبہ ڈاکٹر نظام الدین ایس گوریکر صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ اچھا، کتابت و طباعت غنیمت، صفحات ۲۴۴، مجلد مع گرد پوش۔ قیمت قسم اول ۵ روپے، قسم دوم ۴ روپے۔ پتہ: رائٹرس ایمپوریم لمیٹڈ، خورشید بلڈنگ، سر فیروز شاہ مہتا روڈ، بمبئی

اس میں ہندوستان میں فارسی کے تین نامور شاعروں امیر خسرو، فیضی اور غالب کے حالات و واقعات اور علمی و ادبی کارناموں پر تبصرہ کرنے کے بعد ان کے کلام کا مختصر انتخاب دیا گیا ہے، پہلے غزلوں اور رباعیات کا انتخاب ہے، اور آخر میں ہر ایک کا ایک ایک قصیدہ اور مثنوی شامل ہے، مصنف بمبئی کے ایک کالج میں شعبہ فارسی و اردو کے صدر اور تقریباً تیس ۳۰ سال سے درس و تدریس کی خدمت پر مامور ہیں، ان سے بجا توقع تھی کہ اصل فارسی ماخذ سے یہ کتاب مرتب کی ہوگی، لیکن انھوں نے ان اساطین شعر و ادب کے حالات اردو اور انگریزی کتابوں کی مدد سے لکھے ہیں، خسرو اور فیضی کے حالات میں زیادہ تر شعر العجم کو پیش نظر رکھا گیا ہے، کیونکہ جا بجا اس کی عبارتیں حوالہ کے بغیر الٹ پھیر کر کے اور معمولی تصرف کے بعد نقل کر دی گئی ہیں، جس سے ان کا حسن جاتا رہا ہے، اور زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ اس قطع و برید کی وجہ سے مفہوم کچھ کا کچھ ہو گیا ہے، جیسے مولانا شبلی لکھتے ہیں، "جہانگیر نے تزک میں لکھا ہے کہ شہزادہ دانیال ہندی (برج بھاکا) کی شاعری سے واقف تھا، اور خود بھی کہتا تھا، یہ فیضی ہی کی صحبت کا اثر ہوگا، اسی سنہ میں اکبر نے اجتہاد و امامت کے دعوے سے مسجد میں جا کر خطبہ پڑھا، یہ خطبہ فیضی

نے لکھا تھا" (ص ۳۳) مصنف لکھتے ہیں: "یہ فیضی کی صحبت کا اثر تھا کہ اکبر نے اجتہاد و امامت کے دعوے سے مسجد میں خطبہ جمعہ پڑھا جس کو فیضی نے لکھا تھا" (ص ۵۲) پتہ نہیں اجتہاد و امامت کو سہواً یا قصداً اجتہاد و اقامت سے بدل دیا گیا ہے جو بالکل ہی بے معنی ہے، مولانا شبلی نے فیضی کی تصنیف موارد الکلم کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ کلکتہ میں چھپ گئی ہے، فیضی کے ایک رقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹۸۶ھ کی تصنیف ہے" (ص ۴۴ و ۴۵ جلد ۳) اس میں مصنف کے تصرف نے سنہ تصنیف کو سنہ طباعت بنا دیا، وہ لکھتے ہیں: "یہ کتاب ۹۸۶ھ مطابق ۱۵۷۷ء میں کلکتہ میں شائع ہوئی" (ص ۵۹) بعض جگہ حذف و ترمیم سے عبارت بے ربط اور بے معنی ہو گئی ہے، جیسے شعر العجم میں ہے "شیخ مبارک ناگور سے گجرات اور گجرات سے آگرہ میں آئے، جمنا کے کنارے میر رفیع الدین حسینی کے ہمسایہ میں قیام اختیار کیا اور یہیں ایک معزز خاندان میں شادی کی، خدا نے کثرت سے اولاد دی، جن میں سب سے پہلا فیضی تھا، جو ۹۵۴ھ میں پیدا ہوا، فیضی نے ابتدائی اور انتہائی تعلیم باپ سے حاصل کی" (ج ۳ ص ۳۲ و ۳۳) مصنف نے خط کشیدہ عبارت حذف کر کے لکھا ہے "شیخ مبارک ناگور سے گجرات اور گجرات سے آگرہ پہنچے جہاں انھوں نے ایک معزز خاندان میں رشتہ کر لیا، فیضی سب سے بڑے تھے، جو ۹۵۴ھ مطابق ۱۵۴۷ء میں پیدا ہوئے، فیضی نے ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم بالخصوص اپنے والد ماجد سے حاصل کی" (ص ۵۰) ایک اور جگہ مولانا شبلی نے لکھا ہے "۳۰ سنہ جلوس میں فیضی کو خمسہ کا خیال پیدا ہوا اور سب سے پہلے مرکز ادوار شروع کی، اس کے ساتھ اور مثنویوں کی بھی بنیاد ڈالی اور سب کے کچھ کچھ شعر کہے، لیکن چونکہ بہت سے مشغلے پیش آتے رہتے تھے، کوئی کتاب انجام کو نہ پہنچ سکی ۳۹ سنہ جلوس میں اکبر نے اصرار کے ساتھ کہا کہ خمسہ کو پورا کرنا چاہئے، اور سب سے پہلے نلدمن انجام پائے، چونکہ ہندوؤں کا قصہ تھا، اکبر کے میلان

طبع نے اسکو مقدم رکھا ..." (ص ۶۲، ۶۳) مصنف تحریر کرتے ہیں "یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اکبر نے بھی ۱۰۰۲ھ مطابق ۱۵۹۳ء میں اصرار کے ساتھ کہا کہ خمسہ کو پورا ہونا چاہئے، فیضی نے دوسری مثنویوں کی بھی بنیاد ڈالی، اور سب کے کچھ نہ کچھ شعر کہے، لیکن چونکہ بہت سے مشغلے پیش آتے رہتے تھے، اس لیے سوائے دو کے اور کوئی مثنوی انجام کو نہ پہنچی" (ص ۶۵) اس سے دھوکہ ہوتا ہے کہ اکبر کے اصرار کے بعد ہی فیضی نے مثنویوں کی بنیاد ڈالی تھی، اور اس اثنا میں اور مشغلے پیش آنے کی وجہ سے یہ کام موقوف ہوتا رہا، حالانکہ اکبر کے اصرار سے پہلے ہی وہ خمسہ شروع کر چکا تھا، لیکن مشاغل پیش آنے کی وجہ سے درمیان میں اس کا سلسلہ موقوف کر دینا پڑتا تھا، اگر اکبر کے اصرار کے بعد وہ اس کی تکمیل میں مشغول ہو گیا، یہ الگ بات ہے کہ اسکے باوجود وہ خمسہ کی سب مثنویوں کو مکمل نہیں کر سکا، علاوہ ازیں مولانا شبلی کی خط کشیدہ عبارت حذف کرنے سے مصنف کی عبارت میں یہ التباس بھی پیدا ہو گیا ہے کہ دوسری مثنویاں خمسہ کے علاوہ تھیں، تحریر اور طرز ادا میں ناہمواری کی وجہ سے بعض عبارتیں بڑی گنجلک ہو گئی ہیں اور کہیں کہیں مصنف کے الفاظ سے انکا مدعا واضح نہیں ہو سکا ہے، جیسے وہ لکھتے ہیں،

"اور اس امر کو بھی ملحوظ رکھا ہے کہ شعرا کے متعلق معلومات اسی حد تک تجسس طلب ہوں جس حد تک وہ انکے علم و فن پر اثر انداز ہوتے ہیں" (ص ۲) "بلکہ دنیائے ادب کے سدا بہار باغ کی قفل کشائی کر کے اہل نظر کو گلستان فارسی کی سیر پر مائل و آمادہ بھی کریگا" (ص ۲) "اسکی (کتبخانہ کی) توسیع و اشاعت میں ہر ممکن حربہ استعمال کرتے تھے، احباب اور دوستوں سے کتابوں کی فراہمی کے سلسلہ میں بڑے ادب اور انکساری سے لکھتے تھے" (ص ۱۵) "جب فیضی بیمار ہوئے تو عرفی عیادت کو گئے، فیضی اسوقت ایک پلے سے کھیل رہے تھے، عرفی نے معلوم کیا، اسم مخدوم زادہ چیست، فیضی نے جواب میں کہا ..." (ص ۲۵) "اور اپنی طرف سے انکسار و مناسبت کے ساتھ معذرت کا حق ادا کر دیا ہے"، (ص ۔۔) "اجمالاً غالب کا کلام شعر و ادب کا سدا بہار باغ بھی ہے اور غور و فکر کی پر تکلف ضیافت بھی" (ص ۵، ۶، ۸) "نے" "ان" "اگرچہ" اور "اگر" وغیرہ جن جملوں میں استعمال ہوئے ہیں وہ عموماً صحیح نہیں ہیں، مراۃ العالم کو مرآۃ العلم، سواطع الالہام کو سواد الالہام اور موارد الکلم کو موارد الکلام لکھا ہے، ایک جگہ غنیظ کا املا غیض تحریر کیا گیا ہے، زبان و بیان کی ہر قسم کی غلطیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً نظر ثانی کے بغیر ہی کتاب شائع کر دی گئی ہے، اردو اور فارسی کے استادوں کی جانب سے تحریر و تصنیف میں اسطرح کی بے احتیاطی بالکل ہی مناسب نہیں، "ض"

جلد ۱۱۶ ماہ اگست ۱۹۷۵ء مطابق ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۵ھ عدد ۲

مضامین